(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

تقریر بخاری (اردو)

(مِن باب الوحی الیٰ کتاب الایمان)

۱۳۷۷ھ

افادات شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

جلد اوّل

کفیل احمد کیرانوی فاضل دیوبند

کتبخانہ اسلامیہ دیوبند (یو۔پی)

قیمت تین روپے

آہ حضرتِ اُستاذ رحمۃ اللہ علیہ

زمیں بھی گریہ ساماں ہے فلک بھی ۔۔۔ یہ کس کی لاش اٹھائی جارہی ہے

یہ لکھتے ہوئے قلم لرزتا ہے کہ بارہ جمادی الاولیٰ ۷۷؁ ۱۳ھ بوقت ڈھائی بجے دن میرے محترم استاذ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ایک عرصہ تنفس کی سخت بیماری میں مبتلا رہکر داعیٔ اجل کی آواز پر لبیک فرماتے ہوئے عالمِ شاہد سے عالمِ برزخ کی طرف ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ حضرتِ استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات صرف آپ کے متعلقین ہی کیلئے المناک حادثہ نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کیلئے اور خصوصاً اہل علم حضرات کے لئے ایک نہایت دردناک و اضطراب انگیز سانحہ ہے جس پر کرب و بیچینی کا جسقدر بھی احساس اور گریہ و زاری کا جتنا بھی اظہار ہو وہ کم ہے۔

حضرتِ استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ایک خاص جسم یا ایک خاص شکل کی زندگی نہیں تھی بلکہ حقیقت میں آپ کی زندگی عدل و انصاف کی زندگی تھی، عزم و ایثار کی زندگی تھی، خلوص و دیانت کی زندگی تھی، علم و عمل کی زندگی تھی، شرافت و صداقت کی زندگی تھی، قول و عمل میں مکمل مطابقت کی زندگی تھی، امام بخاریؒ و امام ترمذیؒ کے مقاصدِ حسنہ کی زندگی تھی، مولانا گنگوہیؒ و مولانا نانوتویؒ کے بلند پایہ کردار کی زندگی تھی، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاکیزہ جذبات کی زندگی تھی، اسلافِ صالحین کے مکارمِ اخلاق کی زندگی تھی، صحیح معنی میں ایک نائبِ رسول کی زندگی تھی۔ ـــــ

واحسرتا! ہم ایک ایسی جامع کمالات شخصیت سے محروم ہوگئے جسکی مثال یہ دنیا شاید اب کبھی پیش نہ کر سکے۔ کفر و ضلالت کے اس مہیب دور میں ہمارے سامنے اگرچہ کوئی نبی نہیں تھا تو ـــــ نبی کی ایک بہترین مثال تھی، ایک مکمل نمونہ تھا جسے دیکھکر ہمارے قلوب میں ایمانی تڑپ پیدا ہوتی تھی۔ مگر غم و افکار سے بھری ہوئی اس دنیا میں کسی کو بھی موت سے خلاصی نہیں خواہ کوئی کتنی ہی عظیم الشان خصوصیات کا مالک کیوں نہ ہو۔ بقا صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بے مثال کو ہے۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید ۔۔۔ زجام دھر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان

میری دعا ہے، اللہ تعالیٰ میرے شفیق استاذؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیگا اور اس ہوشربا حادثہ پر ہم تمام غمزدوں کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔

کفیل احمد کیرانوی

نوٹ تقریر بخاری کی کتابت حضرتؒ کی حیات میں مکمل ہوچکی تھی مگر افسوس مالی مشکلات کی بنا پر اس وقت طباعت نہ ہو سکی۔

فہرست مضامین

تصدیق ۳
حرفِ آغاز ۵
تمہید تقریرِ بخاری ۱۱
غایتِ علم حدیث ۱۴
تدوینِ علمِ حدیث ۱۷
حروفِ مقطعات سے متعلق ایک بحث ۲۰
عود الی المطلب ۲۱
بخاری کی وجہ تصنیف ۲۷
کتاب الوحی ۳۴
باب کیف کان بدء الوحی الخ 〃
کتاب الایمان ۱۰۳
باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ ۱۰۶
باب امور الایمان ۱۱۰
باب المسلم من سلم الخ 〃
باب ای الاسلام افضل ۱۱۱
باب اطعام الطعام الخ ۱۱۲
باب من الایمان ان یحب الخ 〃
باب حب الرسول الخ ۱۱۳
باب علامت الایمان الخ ۱۱۷
باب ۱۱۹
باب من الدین الفرار الخ ۱۲۳
باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ ۱۲۴
باب من کرہ ان یعود الخ ۱۲۷
باب تفاضل اہل الایمان الخ ۱۲۸
باب الحیاء من الایمان ۱۳۱
باب فان تابوا الخ ۱۳۲
باب من قال ان الایمان الخ ۱۳۴
باب اذا لم یکن الاسلام الخ ۱۳۷
باب افشاء السلام الخ ۱۳۹
باب کفران العشیر الخ ۱۴۰
باب المعاصی من امر الخ ۱۴۱
باب ظلم دون ظلم ۱۴۴
باب علامات المنافق ۱۴۵
باب قیام لیلۃ القدر الخ ۱۴۷
باب الجہاد من الایمان ۱۴۹
باب تطوع قیام رمضان من الایمان ۱۵۰
باب صوم رمضان الخ 〃
باب الدین یسر وقول النبی الخ 〃
باب الصلوٰۃ من الایمان الخ ۱۵۱
باب حسن اسلام المرء ۱۶۰
باب احب الدین الخ ۱۶۱
باب زیادۃ الایمان الخ 〃
باب الزکوٰۃ من الاسلام ۱۶۴
باب اتباع الجنائز الخ ۱۶۶
باب خوف المومن ان یحبط عملہ وہو لا یشعر ۱۶۸
باب سوال جبریل النبی الخ ۱۷۰
باب ۱۸۳
باب فضل من استبرأ الخ ۱۸۴
باب اداء الخمس الخ ۱۸۵
باب ما جاء ان الاعمال الخ ۱۹۲
باب قول النبی الخ ۱۹۵

تصدیق

از جناب مولانا محمد جلیل صاحب استاذ حدیث و نائب ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ بلاشبہ پیش نظر تقریر عزیزی کفیل احمد (زادہ اللہ علماً و عملاً) نے نہایت ذوق وشوق اور بہت محنت سے مرتب کی ہے اور پھر کئی سال حضرت مدظلہ کے درس میں پابندی کے ساتھ حاضر ہو کر پوری طرح صحت کی سعی کی ہے اور عزیزی ہی کے اصرار پر میں نے بھی اسے دیکھا ہے اور اپنے ناقص علم کی حد تک اصلاح کی کوشش بھی کی ہے اور اس سلسلہ میں قسطلانی، فتح الباری اور عینی وغیرہ سے مدد حاصل کی ہے عزیزی کفیل احمد نے قیام آسام کے دوران مجھے لکھا کہ احقر نے خالص دینی جذبہ اور نیک نیتی سے استاذِ محترم حضرت شیخ مدظلہ العالی کی بخاری کی تقریر جمع کی ہے، حضرت کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے ہمت تو نہیں ہوتی مگر احقر کی دلی آرزو ہے کہ حضرت اسے ایکبار ملاحظہ فرمالیں۔ حضرتِ محترم کی بے پناہ شفقتوں پر نظر رکھتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ والاصفات سے قوی امید ہے کہ حضرت انکار نہیں فرمائیں گے۔"

میں نے یہ تحریر حضرت دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کر دی۔ حضرت نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور فرمایا آپ اسے لکھدیں وہ محنت سے تقریر پوری طرح صاف کرلے میں انشاء اللہ ضرور دیکھوں گا۔ چنانچہ آسام سے حضرت کے تشریف لانے کے بعد کفیل نے ملاقات کی تمنا ظاہر کی۔ حضرت مدظلہ العالی نے بشفقت اسے اپنے خصوصی (مطالعہ کے) کمرہ میں بلالیا۔ کفیل نے اپنی سابقہ تحریر اور حضرت کے جواب کا حوالہ دیتے ہوئے تقریر پیش کر دی۔ حضرت نے بخوشی قبول فرمالیا اور ایک عرصہ بعد میری یاد دہانی پر حضرت نے ارشاد فرمایا بھائی وقت کم ملنے کی وجہ سے مکمل طریقہ سے نہیں دیکھ سکا، کہیں کہیں سے دیکھا ہے، جی چاہتا ہے کہ تقریر کو بالاستیعاب دیکھوں۔ آپ اس وقت اسے لیجائیے اور میری طرف سے کفیل سے کہدیجئے کہ یہ تقریر صرف کتاب الایمان تک ہے اس سے آگے کی تقریر بھی صاف کر لو پھر اس کیلئے مستقل وقت نکالوں گا۔

مگر افسوس اس کے بعد حضرت دامت برکاتہم کی طبیعت ناساز ہو گئی اور ابھی تک برابر علالت چل رہی ہے، اللہ تعالیٰ بجلد حضرتِ موصوف کو صحتِ کاملہ عطا فرما کر ہم گنہگاروں کے سروں پر آپ کا سایہ قائم رکھے۔ حضرت نے ہمیشہ اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شخصیت بہت بڑی شخصیت ہے، ہمارے لئے حق تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے مگر ہم ایسے نالائق ہیں کہ آپ کی شان کے مطابق آپ کی قدر نہیں کرتے۔ دعاگو ہوں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اس نعمتِ عظمیٰ سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہونے کا موقع عطا فرمائے اور نیز عزیزی مرتب کی اس بہترین خدمت کو شرفِ قبول بخشے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

الحمد لحضرۃ الجلالۃ والنعت لخاتم الرسالۃ

درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ ہی کے فضل وکرم اور لطف وعنایت کی بات ہے کہ احقر آپ حضرات کے سامنے "تقریر بخاری" پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے، ورنہ کہاں کفیل اور کہاں بخاری۔ اور اس پر شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی کی ایمان افروز تقریر! کبھی وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ بندۂ عاجز بھی حضرت شیخ کی مکمّل تقریر اس قدر صحیح اور عمدہ پیمانہ پر پیش کر سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ جب کسی کو کوئی شرف اور عزت بخشنا چاہتا ہے تو اس کے لئے کسی قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ تو بہرحال ملکر ہی رہتی ہے۔

دادِ حق را قابلیت شرط نیست بلکہ شرطِ قابلیت دادِ ہست

لیکن تاہم جو طالبعلمانہ خامیاں رہ گئی تھیں بے شمار سجدے اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ رحمت کو کہ وہ تمام کوتاہیاں والد محترم جناب مولانا محمد جلیل صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے اپنی انتہائی مشغولیتوں کے باوجود ان کتابوں کی مدد سے دور فرمادیں، جو حضرتِ استاذ مدظلہٗ کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ یہ پہلی جلد جو آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے کتاب الایمان تک ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اور آپ حضرات نے میری مدد فرمائی، کتاب کو پسند کیا تو بہت جلد دوسری اور تیسری چوتھی جلدیں منصۂ شہود پر ہونگی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ بخاری کا مرتبہ علمِ حدیث میں کسقدر اونچا مرتبہ ہے۔ اصح الکتب بعد کتاب اللہ تعالیٰ کا مقام

بخاری کو۔ اور صرف بخاری کو حاصل ہے۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ استاذِ محترم حضرت مولانا مدنی کا مقام علم و عمل کی کن بلندیوں پر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت موصوف کی شخصیت اپنی شہرت و عظمت کے لحاظ سے کسی تعارف کی قطعاً محتاج نہیں۔ آپ کی بزرگی و طہارت، تقویٰ اور علمی قابلیت سے کون واقف نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آپ علم و عمل شریعت و طریقت اور دقت نظر و حکیمانہ ژرف نگاہی میں نہایت اعلیٰ و ارفع مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے سخت ترین دشمنوں اور مخالفوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ انگریز کہا کرتے تھے، ہمیں مولانا مدنی کے علم، جواں حوصلگی اور عظیم الشان بزرگی پر یقین ہے" مسٹر محمد علی جناح نے بارہا کہا ہے میرے دل میں مولانا حسین احمد صاحب کی عظمت ہے۔ میں انھیں اولوالعزم، سپاہی، مقدس مذہبی رہنما اور بلند پایہ عالم سمجھتا ہوں"

حضرت موصوف مدظلہ نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد مسجد نبوی میں تقریباً بارہ سال علم حدیث علم تفسیر، علم فقہ، علم کلام، اور علم معانی و بیان وغیرہ علوم کا درس دیکر خود وہاں کے اہل زبان متبحر علماء جنھیں اپنی زبان دانی اور شوکتِ علمی پر ناز تھا، سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ جبکہ بہت سی کتابیں ایسی بھی پڑھانے میں آئیں جنکا آپ نے کبھی نام تک بھی نہیں سنا تھا۔

استاذِ محترم تیس بتیس سال سے دارالعلوم میں علوم نبویہ کی اعلیٰ پیمانہ پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آس پاس کے علاوہ دور و دراز ممالک روس چین مشرق وسطیٰ اور افریقہ وغیرہ کے رہنے والے تشنگان علم اور سالکان طریقت اپنے علمی و روحانی جذبات آسودہ کرنیکی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں۔ اور وہ اس پر مجبور ہیں، انھیں اپنے یہاں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو اُن کی آرزوؤں کی تکمیل کر سکے۔ جسکا تقویٰ کامل ہو جس کی دیانت اعلیٰ درجہ کی ہو جس کی علمی و اخلاقی حالت محکم ہو، بلند ہو۔ جسکا عزم مصمم ہو اور عمل جسکا سرمایۂ امتیاز ہو۔

استاذِ محترم کے دینی جذبات بہت نازک ہیں معمولی معمولی غیر اسلامی باتوں سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ آپ کے نزدیک جو چیز حق یا خلاف حق ہوتی ہے، اس کے بے باکانہ

اظہار کرنے میں نہ کبھی آپ نے مصلحتوں کا سہارا لیا ہے اور نہ کبھی آپ کی جرأت مضمحل ہوئی ہے. خواہ حالات کتنے ہی خطرناک رہے ہوں مکہ معظمہ سے سنگینوں کے سایہ میں مسکراتے ہوئے مالٹا جانا. کراچی اور مرادآباد وغیرہ جیلوں میں انگریزی مظالم کے سامنے سینہ سپر ہوجانا. سب کچھ اسی مردانہ جذبہ کا نتیجہ ہے. علمی، اخلاقی، روحانی سیاسی غرض زندگی کے ہر اہم پہلو کے لحاظ سے آپ کی شخصیت اپنی پوری جماعت میں سربلند نظر آتی ہے، میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی نے ایڑیاں اٹھاکر آپ کے برابر ہونیکی جدوجہد کی بھی تو کچھ ہی عرصہ بعد اُسے نادم ہوکر اپنی اصلی جگہ آنا پڑا.

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

اُستاذِ محترم جہاں ہمیشہ سے بہت سی خصوصیتوں کے حامل رہے ہیں، وہاں قدرت کے فیاض ہاتھوں نے آپ کی طبیعت میں ظرافت وجودت اور تیزی بھی کامل طور پر جمع فرمائی ہے. آپ کی کوئی مجلس اور کوئی درس ایسا نہیں ہوتا جو بزلہ سنجیوں سے خالی ہو. اس وقت آپ کی عمر تقریبًا اسی سال ہوگی. کمزوری وضعیفی اپنے شباب پر ہے لیکن اس کے باوجود آپکا عزم جواں ہے. ارادے چست ہیں. ضعیفی کے اس دور میں درحقیقت یہ آپ ہی کی عالی ہمتی کی بات ہے کہ برابر پابندی کے ساتھ درس وتدریس کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں. کتنی ہی تیز آندھی ہو اور کتنی ہی طوفانی بارش بخاری کا درس ہوکر رہے گا کوئی وجہ نہیں کہ درس نہ ہو. کتنا روح پرور اور دلکش ہوتا ہے وہ منظر جب آپ اپنے مکان سے درس دینے کیلئے دارالحدیث تشریف لاتے ہیں شاہانہ وقار ودبدبہ آپ کے قدم چومتا ہے. محدثانہ عظمت آپ کے اُوپر قربان ہوتی ہے. درسگاہ میں آپکی آمد پر کوئی طالبعلم کھڑا نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی ناواقف جدید طالبعلم لوجہ التعظیم کھڑا ہوجاتا ہے تو آپ اس پر سخت ناراض ہوتے ہیں آپ کا معمول ہے درسگاہ میں داخل ہونے کے بعد آپ تمام حاضرین کو بآواز بلند السلام علیکم فرماتے ہیں. ورنہ ہم نے اوروں کے یہاں کا معاملہ اس کے برعکس دیکھا ہے. بخاری کا درس

چوبیس گھنٹے میں تین مرتبہ ہوتا ہے ڈھائی گھنٹے صبح ساڑھے نو سے بارہ تک اور ایک گھنٹہ عصر سے مغرب تک اور ڈھائی گھنٹے بعد العشاء
کچھ طلباء پر رات کا یہ درس بڑا شاق گذرتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جتنا لطف اس سبق میں آتا ہے وہ صبح کے حصے
میں نصیب نہیں ہوتا۔ کسی نے دیکھا فلاں صاحب بیٹھے ہوئے اونگھ رہے ہیں فوراً ایک
پرچی حضرت تک پہنچا دی کہ فلاں صاحب بحرِ نوم میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ تنبیہ فرما
دیجئے گا، حضرت نے نام لیکر زوردار لہجے میں فرمایا چلئے اٹھئے —— جلدی اٹھئے مٹکے
میں (جو پانی پینے کے لئے باہر رکھا رہتا ہے) غوطہ لگا کر آئیے۔ وہ صاحب جیسے ہی ڈبے
ڈبے اٹھے حضرت نے زیر لب مسکراتے ہوئے فرمایا سب دیکھئے یہ ہیں وہ صاحب جو
بخاری کے درس میں آکر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ وہ صاحب اور پانی پانی ہو گئے ؎

بھری محفل میں ہائے کیسی رسوائی ہوئی۔ استاذِ محترم نے مصرعہ پڑھا اور پوری درسگاہ مہذب قہقہوں
سے گونج اٹھی۔ سردیوں کی راتوں میں ہر روز ہی اس قسم کی چار چھ وارداتیں ہو جاتی ہیں۔

طالبعلموں پر استاذِ محترم کی انتہائی مشفقانہ نظر رہتی ہے۔ آں موصوف درس میں کبھی کسی پر
ناراض نہیں ہوتے۔ آپ کی طرف سے ہر طالبعلم کو عام اجازت رہتی ہے وہ ہر قسم کا سوال
کرسکتا ہے۔ بعض بعض طالبعلم تو ایسے لچر اور بے تکے سوال کرتے ہیں کہ دوسرے لڑکوں
کو بھی غصہ آجاتا ہے۔ لیکن کمال ہے حضرت کی درخشاں پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی جھلک
بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ برابر خندہ پیشانی سے ان کے سوالات کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔

اسی باعث ایسے ایسے طالبعلم جنھیں میزان سے لے کر موقوف علیہ تک کہیں لب
کشائی کی بھی جرأت نہیں ہوتی بخاری میں آکر زبان دراز ہو جاتے ہیں —— یوں تو اور بھی
بہت سے حضرات درس و تدریس میں منہمک ہیں اور احقر کو بھی ان سے شرفِ تلمذ
حاصل ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کیفیت بخاری کے پہلے درس میں پیدا ہوئی وہ
آٹھ سال کے طویل عرصہ میں بھی کہیں محسوس نہیں ہوئی امام مالکؒ کا قول ہے لیس العلم
بکثرۃ الروایۃ انما ہو نور یضعہ اللہ فی القلب۔

استاذِ محترم کی ٹھوس عالمانہ تقریروں نے میرے دل و دماغ کی آنکھیں کھولدیں۔ آپکی شاگردی کے شرف سے محروم رہجانا میرے لئے بڑی ہی بدبختی کی بات ہوتی پھر جناب حق تعالیٰ کا یہ اور بھی بڑا فضل ہوا کہ احقر کو تین سال مسلسل بخاری کی سماعت کا موقع ملا ہے۔

آں موصوف کی تقریر بہت سے مختلف مضامین پر مشتمل ہونے کے باوجود نہایت صاف سلجھی ہوئی اور شستہ ہوتی ہے حتیٰ کہ کمزور طالبعلموں کے چہرے بھی درس میں ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ آپ کا درس بلاوجہ کے طول اور منطق و فلسفہ کی باطل نوازالجھنوں سے بے نیاز رہتا ہے، لیکن اگر کبھی کوئی مسئلہ منطق و فلسفہ سے متعلق چھڑ جاتا ہے تو اُسپر آپ نہایت شرح و بسط کے ساتھ عمدہ بحث فرماتے ہیں۔ استاذِ محترم کی تنخواہ دارالعلوم سے ساڑھے پانچسو روپیہ متعین ہے۔ لیکن پورے سال میں سوائے رمضان کے مہینہ کے (جو کہ چھٹی کا مہینہ ہی) کسی مہینہ میں پوری تنخواہ تو کیا نصف بھی نہیں ملتی۔ آپ ہمیشہ سے اس اصول کے پابند ہیں کہ جتنے روز کی رجسٹر میں حاضری ہوتی ہے صرف اسی حساب سے تنخواہ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ ایک پیسہ بھی لینا آپ کے نزدیک گناہِ عظیم ہے درانحالیکہ آپ تمت تک اپنی کتاب بھی ختم کرا دیتے ہیں اور دارالعلوم جن چھ گھنٹوں کے عوض میں تنخواہ دیتا ہے وہ بھی پورے ہوجاتے ہیں۔ مگر چونکہ رات کے تین گھنٹے رجسٹر میں نہیں لکھے جاتے اور ان گھنٹوں سے وہ کمی پوری نہیں ہوتی جو رخصتوں کی صورت میں درج رجسٹر رہتی ہے اس لئے حضرت موصوف دارالعلوم کے اصرار کے باوجود اپنے اصول سے نہیں ہٹتے۔ اسی قسم کی تو چیزیں ہیں جنھوں نے احقر کو حضرت کا انتہائی عقیدت کیش بنادیا۔ ورنہ جاہلانہ اور کورانہ عقیدت کو تو میں بہت برا سمجھتا ہوں ــــ میرا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی جہالت کے اس مہیب دور میں بھی اسوۂ رسول سیرۃ صحابہ اور طریقۂ سلف کی متحرک تصویر دیکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ استاذنا الکرم کی زندگی کا مطالعہ کرے۔

وفی لنبی اللّٰہ حق وفائہ　　　واکرم اوصاف الکرام وفائہ

استاذ محترم کی زندگی شروع ہی سے دینی اور علمی مشاغل میں بسر ہو رہی ہے۔ تعلیمی مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں، بہت اہم مسئلہ ہے، بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں مسلمان کے لئے یہی مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ آدمی کو اگر یہی معلوم نہ ہو کہ مسلمان ہونیکا کیا مطلب ہے، اسلام درحقیقت کہتے کسے ہیں۔ وہ دنیا کو کن اصولوں اور کن ضابطوں پر لیجانا چاہتا ہے، اس کا اساسی مقصد اور پروگرام کیا ہے۔ وہ اپنے افراد کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر ان سے کیا کام لینا چاہتا ہے اور ان کی تربیت سے اس کی غرض کیا ہے۔ تو ایمان سے بتلائیے ایسے شخص سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور کیا وہ اسلام کی خدمت انجام دے سکتا ہے؟ میں تو یہ کہتا ہوں ایسے آدمی کا اسلام پر قائم رہنا ہی بہت مشکل ہے۔ جب اس کے پاس علم کی روشنی ہی نہیں جس سے صحیح راستہ دیکھ سکے تو شیطان کسی وقت بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر غلط راستہ پر لیجا سکتا ہے ــــــ سکتا کیا معنی بلکہ لیجا رہا ہے کمیونزم کی طرف جو لوگ ہجوم در ہجوم جا رہے ہیں ان کی یہی صورت ہے۔ اگر یہ لوگ اسلام سے واقف ہوتے تو ــــــ بخدا مر جاتے کمیونزم کی راہ نہ چلتے! افسوس آج مسلمان اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کے مدعی کتاب وسنت کی مقدم اور حقیقی تعلیم سے گریز کر رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں۔ عوام کو تو چلئے چھوڑ دیجئے وہ تو ہیں ہی عوام ــــ رونا تو دراصل ان کا ہے جو خواص میں شامل ہیں اور جنہیں نیابتِ رسول کے دعوے ہیں۔

وہ بھی اپنی اولاد کو کتاب وسنت کی مقدم تعلیم سے بچاکر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرف لیجا رہے ہیں۔ صرف اس باطل خیال سے کہ اچھی ملازمتیں ملینگی، زندگی آرام سے گذریگی۔ واحسرتا! جن مقدس گھرانوں سے علم وہدایت اور عزم وعمل کے پیکر نکلنے چاہئیں تھے۔ آج وہاں جہالت و بدکرداری کے نمونے اور مجسّم شیطان نکل رہے ہیں۔

کفیلؔ جس پہ یقیں تھا خلوص کا وہ بھی رہِ وفا سے گریزاں ہے دیکھئے کیا ہو

میں کالج و یونیورسٹی کی تعلیم کو بُرا نہیں سمجھتا بلکہ اس لحاظ سے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے

ذریعہ ہمیں دُنیا کا مزاج معلوم ہوسکتا ہے اعلاءِ کلمۃ الحق میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ لیکن جسکا مرتبہ دراصل مقدم ہے اُس کو تو بہر حال مقدم ہی رکھنا چاہئے نا! میں یہی کہنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ میرا دوسرا مقصد نہیں ہمارا اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ رہجانا اصل میں یہی بنیاد ہے ہماری تباہی و پستی کی، ذلّت و بربادی کی اور تمام خرابیوں کی۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیا کی امامت ہمیں سونپی گئی تھی۔ بحر و بر ہمارے زیرِ نگیں تھے، ہم جسطرف قدم اٹھاتے تھے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ باطل کی کوئی طاقت ہماری مزاحمت نہ کرسکتی تھی ــــ ہمیں اسلام نے بہت اُونچا مقام عطا فرمایا تھا مگر افسوس ہم نے اس کی قدر نہ کی۔ اور اپنے غلط کردار کے باعث اپنے اصل مقام (امامت) سے بے لسبی (غلامی) کی ذلیل وادیوں میں جا پڑے جہاں ہماری زندگی طاغوت کے رحم و کرم کی محتاج ہے۔ میں پوچھتا ہوں کوئی قوم کسی کے رحم و کرم پر آخر کب تک زندہ رہ سکتی ہے؟ مجھے بتلائیے یہ جمود، یہ بے حسی، یہ غفلت، یہ بے نظمی، یہ جہالت آخر تابکے؟

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ــــ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ہمارے موجودہ طرزِ عمل سے نہ صرف یہ کہ ہمیں ہی نقصان پہنچا ہے بلکہ کائنات کے ایک ایک ذرہ کو نقصان پہنچا ہے۔ ظلم و طغیان کا بڑھنا، ہر روز نئے نئے سنگین فتنوں کا اُٹھنا، دنیا کی ہر ہر چیز کا بے مصرف استعمال ہونا، ہواؤں کا فصل کے موافق نہ چلنا، بارشوں کا بے موقع برسنا، بے سہارا غریب لوگوں کا فقر و فاقہ کی نظر ہو جانا، شرم ناک جرائم کا دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلنا یہ سب کچھ ہماری ہی جہالت اور غلط روی کے ثمرات ہیں جسکا ہمیں ایک دن مالکِ ارض و سما کو آگے جواب دینا ہوگا۔

میری دلی آرزو ہے کہ ہر طالبعلم معتزلہ و خوارج اور مرجیت و جہمیت کے بے فائدہ جھگڑوں اور صفات کے عین وغیرہ ہونے کے متعلق فلسفیانہ کاوشوں میں اپنا تمام قیمتی وقت صرف کرنیکے بجائے اپنے زمانے کے اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی اور مہیب فتنوں کا سدِ باب کرنیکی

استعداد پیدا کریں. اسلام کے اصولوں کو سمجھیں اس کے تقاضوں اور مطالبوں کو پہنچائیں اور حد جواز میں رہتے ہوئے ہر وہ طاقت حاصل کرنے کی جد وجہد کریں جس سے اسلام کو دوسرے تمام اصولوں پر، تمام نظریات پر، تمام مذاہب پر تغلب، دبدبہ، رُعب اور ہر اعتبار سے شوکت حاصل ہو یہی وہ مقصد ہے جسے ہادئ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے ہیں ہو الذی ارسل رسولہ بالہدی ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون۔

ہمیں یقین ہے اگر آج امام بخاری رحمہ اللہ موجود ہوتے اپنی مجتہدانہ شان، دقت رسی اور وقت شناسی کی بدولت اپنے ابواب وتراجم اور عنوانات کا رُخ اعتزال وجہمیت کی تردید کے بجائے عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کی طرف پھیر دیتے۔

اب آخیر میں اپنے مخلص دوست علی احمد گورکھپوری کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں میں ممنون ہوں درحقیقت اگر موصوف نے "تقریر بخاری" کی تدوین میں میری ساتھ تعاون نہ کیا ہوتا تو یقیناً بندہ کو ناقابلِ عبور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ دعاگو ہوں اللہ تعالیٰ میرے قابلِ فخر دوست کو عالم کونین کی خاطر خواہ لذتیں نصیب فرمائے۔

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم　　　صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

کفیل کیرانوی
۱۴راگست ۱۹۵۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ اجمعین **اما بعد** فان اصدق الحدیث کتٰب اللہ وخیر الھدی ھدے سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار و بالسند المتصل الی الامام الحافظ الحجۃ امیر المومنین فی الحدیث ابی عبد اللہ محمد بن اسمعیل ابن ابراھیم ابن مغیرۃ ابن بردزبۃ الجعفی البخاری رحمھم اللہ تعالیٰ ونفعنا بعلومہ اٰمین

ہر علم کی ابتداء سے پہلے اس کی حد، اس کی غایت اور اس کے موضوع کا جاننا ضروری ہے. حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں کے جاننے پر شروع فی العلم موقوف ہے، اس لئے ان کا جاننا نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ ناگزیر ہے. جس فن کی یہ کتاب ہے اسکا نام فنِ حدیث ہے. حدیث لغۃً جدید کو کہتے ہیں جو کہ قدیم کی ضد ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر لغت و اصطلاح میں کیا مناسبت ہے، جواب یہ ہے کہ اصطلاح میں اس فن کو فنِ حدیث کہنے کی مختلف توجیہات ہیں اول یہ کہ اس فن کو کلام اللہ کے مقابلہ میں رکھتے ہوئے فنِ حدیث کہا گیا ہے. کلام اللہ قدیم ازلی ہے. اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے. بخلاف کلام رسول کے. کیونکہ یہ حادث ہے. اس کی تعریف ہے علم یعرف بہ ما انسب الی احوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم قولاً او فعلاً او تقریراً او صفۃً اور ظاہر ہے کہ یہ اس کے حادث ہونے پر دال ہے صفۃً سے عبارت ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا ذکر کیا جانا مثلاً آپ دراز قد نہیں تھے اور نہ پستہ قد۔ آپ کے اخلاق حد درجہ بلند اور ارفع تھے. آپ انتہائی سخی اور حلیم تھے وغیرہ وغیرہ. خلاصہ یہ ہے کہ منسوبات الی النبی علیہ السلام کو "حدیث" کہا گیا ہے دوم یہ کہ اصل میں جسطرح انسان کا کلام شیئاً فشیئاً پایا جاتا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور آپ کی تقریریں شیئاً فشیئاً پائی گئی ہیں، نجماً نجماً سامنے آئی ہیں

اس لئے انھیں حدیث کا نام دیا گیا گویا ہر کلام حدیث ہے. پہلی اور دوسری توجیہہ میں فرق یہ ہوا کہ پہلی جگہ کلام اللہ قدیم ازلی کے اعتبار سے حدیث نام تھا اور دوسری توجیہہ میں اسکا خیال نہیں کیا گیا. بلکہ اس لحاظ سے کہا ہے کہ ہر جدید حادث کو حدیث کہہ سکتے ہیں. لیکن عرف عام میں صرف کلام کو حدیث کہتے ہیں فلان حدثہ کذا وکذا. محدثین کرام نے اس کو عرف عام سے علم خاص کیلئے اخذ کر لیا معلوم ہوا کہ حدیث کے اصل معنی جدید کے ہیں. پھر اسکو مطلقاً کلام کی طرف نقل کر لیا گیا اور بعد میں فن خاص کی طرف منقول!

سوم یہ کہ جناب حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اما بنعمۃ ربک فحدث. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تحدیث نعمت کا حکم کیا گیا ہے. اس سے پہلے تین نعمتوں کا ذکر ہے. الم یجدک یتیماً فاوی. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یتیم تھے، بے سہارا تھے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ٹھکانا عطا فرمایا. ووجدک ضالاً فہدیٰ. آپؐ ان راہوں سے ناآشنا تھے جو حقیقت میں منزل رسا تھیں اور جنہیں اللہ تعالیٰ کی رضا پوشیدہ تھی. خداوند قدوس نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کو وہ راہیں بتلائیں بلکہ ان کے نشیب و فراز سے بھی روشناس کرایا، آگاہی بخشی. ووجدک عائلاً فاغنیٰ. آپؐ فقیر تھے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو غنا جیسی عظیم الشان دولت بخشی. مذکورہ نعمتوں کا شکر ادا کرنا آپؐ کا فرض منصبی ہے. جسکی عملی صورت یہ ہے کہ تم بھی بے ٹھکانا لوگوں کو ٹھکانا دو، یتیموں کے کفیل بن جاؤ جیسے ہمنے یتیمی کی حالت میں تمہاری کفالت کی ان تمام خطروں کا سد باب کر دیا جو یتیمی کی وجہ سے پیدا ہو سکتے تھے انا وکافل الیتیم کھاتین. نادار اور مفلس لوگوں کو جھڑکو نہیں ان کے ساتھ فراخ دلی اور خوش اخلاقی سے پیش آؤ جیسے ہم تمہاری ساتھ پیش آئے. ہمارے احسانات کو زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے سامنے واضح طور سے بیان کرو! ـــــ تحدیثِ نعمت سے مراد یہی اقوال وافعال رسول اللہ ہیں اس وجہ سے انھیں "حدیث" کے نام سے موسوم کیا گیا.

مذکورہ تفصیل سے علم حدیث کی حد معلوم ہوگئی اور وہ یہ ہے علم یعرف بہ ما انسب الی احوال النبی

صلی اللہ علیہ وسلم قولاً او فعلاً او تقریراً او صفۃً۔

اب معلوم کرنا چاہیئے کہ احادیث مرفوعہ یعنی وہ احادیث جن کی نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو اس فن میں دراصل وہی داخل ہونگی۔ موقوف حدیثیں جنکی نسبت صحابی کیجانب ہو یا منقطع حدیثیں جن کی نسبت تابعی کیطرف ہو وہ اس فن سے خارج ہیں۔ انھیں حقیقت میں حدیث نہیں کہا جاسکتا! قولِ مشہور یہی ہے کہ موقوف و منقطع حدیث میں داخل نہیں۔ لیکن خود امام بخاریؒ اور دوسرے بلند پایہ محدثین نے حدیث سے متعلق اپنی تصانیف میں احادیث غیر مرفوعہ کو بھی ذکر کیا ہے۔ جمہور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اصل میں یہ حدیث تو نہیں لیکن تاہم حدیث میں داخل ہیں تبعًا اس کی وجہ یہ ہے کہ متقدمین ہمیشہ اسی فکر وجستجو میں رہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واقوال کی ممکن حد تک پیروی کریں یہ نیک نیت اور مخلص حضرات اتباعِ نبی میں نہایت سخت اور بڑے محتاط تھے۔ اس لئے کہا جائیگا کہ ان کے اعمال واقوال حکماً آنحضورؐ ہی کے اعمال واقوال ہیں۔ اور پھر "حدیث" کی تعریف ان الفاظ سے بھی تو کی جاتی ہے علم یعرف بہ ما اُضیف الی اقوالِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَو الی الصحابی اَو اِلی التابعی...... اس تعریف کی رو سے موقوف ومنقطع کا "حدیث" میں داخل ہونا ظاہر ہے۔ لیکن تعریف درحقیقت پہلی ہی ہے!

اگر کوئی صحابی یا تابعی غیر مدرک بالعقل کوئی بات بیان کرے اور وہ اسرائیلی روایات سے منقول نہ ہو تو تبعًا وہ روایت مرفوع سمجھی جائے گی اس سے علم حدیث کے موضوع کی جانب بھی اشارہ ہو رہا ہے۔ علم حدیث کا موضوع اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت ہے من حیث انہ رسول کی قید کے ساتھ۔ یوں تو آپؐ کی ذات گرامی سے متعلق بحث بہت سی حیثیات سے ہوسکتی ہے مگر محدث ہر پہلو سے ہٹکر صرف رسول ہونیکی حیثیت سے بحث کرتا ہے۔ پھر چونکہ شرافتِ موضوع شرافتِ فن کی طرف موصل ہوتی ہے اس لئے علم حدیث کا اپنے موضوع کے اعتبار سے اشرف ہونا بوضاحت معلوم ہو گیا۔ مثلاً فن طب

میں جسم انسانی کی صحت ملحوظ ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ فن اس فن سے عمدہ ہے جس میں حیوانات سے من حیث الصحت بحث ہو۔

پڑھے لکھے آدمی سب ہی جانتے ہیں کہ انسانوں میں انبیاء علیہم السلام سب سے افضل ہیں اور پھر ان میں بحسب قدر و مراتب ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔ مگر قدرت نے فخر موجودات، سرکار دو عالم، ہادئ زماں، نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر فضیلت بخشی ہے۔ ارضیات کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لیکر فلکیات کے بڑے سے بڑے سیارے تک کی پیدائش دراصل آپؐ ہی کی مرہونِ احسان ہے۔ معلوم ہوا کہ تمام مخلوقات میں آنحضرت کا مرتبہ سب سے زیادہ اونچا اور بلند ہے۔

غایتِ علم حدیث | علم حدیث کی غایت آپؐ کے فرائض کی تفصیل سے دریافت ہوگی قرآن کا فرمان ہے یتلوا علیہم اٰیٰتک ویعلمہم الکتٰب والحکمۃ ویزکیہم۔ پہلا فریضہ تلاوتِ آیات ہے۔ دوسرا تعلیم کتاب۔ تیسرا تعلیم حکمت اور چوتھا تزکیہ ہے۔ پہلے فرض کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ لوگوں کے سامنے پڑھکر سنائے جائیں اور ان کو یاد کرایا جائے۔ دوسرے فرض کا منشا کتاب کی تعلیم ہے یعنی احکام و معانی کو سمجھانا۔ تیسرے فرض کی عبارت ہے ہر حکم کی حکمت، اس کی غرض و غایت اور فوائد و نقصانات سے آگاہ کرانا۔ چوتھا فرض تزکیہ ہے۔ یہ فرائض ثلثہ کے بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ ان تینوں کے مغایر ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں عرض رسا ہوئے کہ یا رسول اللہ اتنے ہم آپؐ کی مجلس میں رہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت وجہنم دونوں بالکل ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن آپؐ کی مجلس سے علیحدہ ہونے کے بعد نہ وہ کیفیت باقی رہتی ہے اور نہ وہ اذعان — بلکہ دنیا ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اسی کیفیت کا نام تو تزکیہ ہے۔ اللہ کے رسول کو دیکھکر دنیا سے خود بخود اعراض اور طبیعت کا اللہ کی طرف میلان ہونے لگتا ہے۔ اس کا اثر مومن کامل میں پایا جاتا

ہے۔ بندۂ حق آگاہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے، مومن کامل وہی ہے جس کی صحبت میں خدا یاد آئے، توجہ الی اللہ زیادہ ہو۔ آپ کے ساتھ یہ اثر قوی تھا اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ یوں بعد کے لوگوں میں بھی یہ بات رہی اور آج تک ہے۔ مگر بہت کم۔ صحابہ کی تمام امت پر فضیلت کی یہی وجہ ہے۔ تزکیۂ کامل ہی نے ان حضرات کو جملہ فضائل کا مستحق بنا دیا۔ آپؐ نے قرآن پڑھکر سنایا، سمجھایا اور اس کی حکمتیں بیان فرمائیں۔ یہ تمام باتیں احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہیں۔ تو یہ احادیث ان فرائض کی ادائیگی کا ذریعہ بنیں ۔ انا انزلنا علیک الذکر لتبین للناس۔ اس آیت سے مذکورہ بالا تفصیل کی طرف اشارہ ہو رہا ہے دوسری جگہ ہے ان علینا جمعہ وقرآنہ۔ اس کی تفصیل بھی اسی کی جانب مشیر ہے اسی وجہ سے امام ماتریدی کہتے ہیں کہ حقیقت میں تفسیر مراد اللہ کے بیان کا نام ہے۔ اور خدا کی مراد کا علم بغیر وحی کے ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہا گیا من فسر القرآن برأیہ فقد کفر۔ صرف اللہ کے رسولؐ کی پیش کردہ باتیں تفسیر کہی جائینگی۔ باقی رہیں علماء کی بیان کردہ چیزیں تو انھیں تاویل کہینگے نہ کہ تفسیر۔ تفسیر چونکہ قطعی چیز ہے اس لئے وہ صرف احادیث ہی کے ذریعہ ممکن ہو سکتی ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ احادیثِ رسول قرآنِ کریم کی تفسیر اور بیان ہیں تو اب یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ علمِ حدیث کی غایت ہے ما جاء بہ الرسول کی تفصیل و ریافت کرنا۔ بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ تفسیر سے حدیث کیونکر بڑھ سکتی ہے؟ جبکہ تفسیر کا موضوع کلام اللہ ہے جو کہ باری تعالیٰ کی صفت ہے غیر مخلوق اور قدیم ہے۔ اور حدیث کا موضوع آنحضرتؐ کی ذات ہے جو مخلوق اور حادث ہے۔ باین وجہ تفسیر کو اشرف و افضل ہونا چاہیئے حدیث سے؟ یہ سوال بجائے خود نہایت اہم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا جواب مختصر مگر مکمل طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ "حدیث" چونکہ تفسیر حقیقی ہے اس لئے اس کی اشرفیت ظاہر و باہر ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو تر و تازہ اور شگفتہ رکھے جس نے میری بات سُنی اور اس کو محفوظ رکھا اور دوسروں تک پہنچایا۔

یہ حدیث بالکل صحیح ہے. اس کے اندر دعا کی گئی ہے، اور یہ دعا قیامت تک کے لئے ہو لیکن اس کا مصداقِ اوّلی ظاہر ہے کہ محدثینِ عظام ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ان کا کام ہی ہمہ وقت یہ رہا ہے سمعہا و دعاہا واداہا۔ اس باب میں دوسری احادیث بھی وارد ہوئی ہیں. نیز شرافت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ان اولی الناس بی یوم القیامۃ اکثرہم علیّ صلوٰۃ. جو سب سے زیادہ مجھ پر درود بھیجینگے وہ قیامت کے دن مجھ سے نسبۃً زیادہ قریب ہوں گے. درود کی بڑی فضیلت ہے جہاں تک ہو سکے اس کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیئے. اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں ان اللہ وملائکتہ یصلّون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کہتے ہیں من صلّی علیک مرۃ صلی اللہ تعالیٰ علیہ عشرا. حقیقت میں درود ایک عبادت ہے اور اس عبادت کو محدثین کی جماعت جس کثرت اور پابندی کے ساتھ ادا کرتی ہے دوسرے لوگوں کو اکی توفیق کم ہوتی ہے ہر حدیث میں کم از کم ایک مرتبہ لفظِ صلوٰۃ ضرور آتا ہے. اس لئے مشتغل بالحدیث بڑی کثرت سے درود بھیجتا ہے۔ علاوہ ازیں شرافت کی اور بھی وجوہ بیان کی جاتی ہیں. حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے علم پڑھنے پڑھانے اور طریقت میں کمال حاصل کرنے کے بعد "حرمین شریفین" کا سفر کیا اور وہاں جو مکاشفات ہوئے انھیں حضرت موصوف نے اپنی کتاب "فیوض الحرمین" میں جمع کیا ہے. اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں، میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب متوجہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ آنحضورؐ کے قلب مبارک سے مشتغل بالحدیث کے قلب تک ایک نہایت نورانی دھاگہ جارہا ہے، شاہ صاحب وصیت فرماتے ہیں اے میری کتاب کے دیکھنے والے تیرے لئے ضروری ہے کہ تو اشتغال بالحدیث رکھے تاکہ وہ نورانی دھاگہ تیرے ساتھ بھی قائم ہو جائے اشتغال خواہ درس وتدریس کی صورت میں ہو خواہ تصنیف وتالیف کی اور خواہ مطالعہ کی بہر حال اس کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ رکھنی چاہیئے.

کیفیات سے متعلق بحث مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ خالقِ ارض وسما نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہے۔ ذکر سے مراد صرف قرآن ہو یا تمام دین، دونوں ہو سکتے ہیں۔ یہ وعدہ تاکید کے ساتھ کیا گیا ہے کیونکہ جملہ اسمیہ استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ نیز لفظ انّا اور لام موطوئہ للقسم کا استعمال کیا ہے بایں طور یہ جملہ تین طرح سے مؤکد ہو گیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "ذکر" کی حفاظت کے لئے کافی اہتمام فرمایا ہے۔ اگر ذکر سے مراد صرف قرآن ہی لیا جائے تب بھی اس کی حفاظت اس کے معانی اور اس کی تفسیر کی حفاظت سے ہوگی۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبیّن ذکر ہیں اور قرآن ذکر اور تفاسیر و معانی ذکر کا بیان ہیں۔ اللہ تعالیٰ جیسے الفاظ قرآنی کا محافظ ہے ایسے ہی معانی کا بھی محافظ ہے۔ لہذا احادیث کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوئی۔

اور اگر "ذکر" سے مراد مطلق دین ہے، پھر تو حفاظت حدیث کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ظاہر ہے ہی۔ بخلاف دوسرے ادیان کے۔ کہ ان کی حفاظت خود اہل ادیان پر تھی۔ اسلام کی حفاظت کا وعدہ خود جناب حق تعالیٰ نے فرمایا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ خداوند قدوس ایسے اسباب پیدا کرتا رہے گا جن کے ذریعہ "دین" کو صحیح طور پر بالکل محفوظ رکھا جا سکے، تخریب و تحریف سے، باطل کی خطرناک یورشوں سے۔ تو سب سے پہلے اس "ذکر" کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب فرمایا۔ آپؐ پر قرآن نازل کیا اور اس کی محافظت کی صورتیں آپؐ کو بتائی گئیں ——— لاتحرك به لسانك لتعجل به اور ان پر تسہیل کردی گئی۔ ان علینا جمعہ وقرآنہ ثم ان علینا بیانہ۔ اسیطرح معانی کی تفہیم بھی آپؐ کے ذریعہ کرائی گئی۔ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ حکیم کو جسطرح اپنے سینۂ مبارک میں محفوظ رکھا، اسی طرح آپؐ نے قرآن مجید کی کتابت کرائی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ذہن نشین کرایا۔ آپؐ کے عہد مبارک میں سیکڑوں حفاظ موجود تھے۔ اور آپؐ کی موجودگی

ہی میں سُور کے اندر آیات کی ترتیب ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس ترتیب کو توقیفی کہتے ہیں۔ قرآن سطور و صدور میں آپؐ ہی کے زمانہ میں محفوظ ہو گیا تھا۔ کئی سو صحابی پورے قرآن کے حافظ تھے اور آدھے پونے کے تو اس قدر تھے کہ ان کا شمار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کی حفاظت کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے گئے نماز میں قرائت فرض قرار دی گئی، عہدوں اور دوسری ملکی ضرورتوں میں حافظِ قرآن کو مقدم رکھا گیا۔ اور پھر قبروں میں اسے جو درجہ دیا گیا "غزوہ احد" اس کا شاہد ہے۔ نیز جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حافظِ قرآن کے نہایت عظیم الشان الفاظ میں فضائل بیان فرمائے ہیں اس کی تفصیل روایات میں مذکور ہے۔ آپؐ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ناقتین سمائین کو ماوین سے زیادہ اچھی دو آیتیں ہیں۔ حالانکہ اہل عرب کے نزدیک ایسی اونٹنیاں انفسِ اموال میں شمار ہوتی تھیں اس سے حفظ قرآن کی طرف ترغیب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے جس نے قرآن سے ایک حرف پڑھا اس نے بلاشبہ دس نیکیاں کمائیں۔ لا اقول "الم" حرف بل الف حرف ولام حرف ومیم حرف۔

آج بعض احمق کہتے ہیں کہ بلا سمجھے قرآن پڑھنا عبث ہے، بے سود ہے ان کا یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے۔ ظاہر ہے کہ "الم" اور دوسرے مقطعات کے معنی معلوم نہیں ہیں اس کے بارے میں بڑے بڑے اہل علم حضرات "اللہ اعلم بمرادہ" کہکر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جب ایسے الفاظ کی بابت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نیکیوں کو فرماتے ہیں تو معلوم ہوا کہ معنی کا سمجھنا حصول ثواب کے لئے ضروری نہیں، صحابہ کے قلوب میں ایمان کامل ہونیکی وجہ سے قرآن کی انتہائی عظمت تھی، وقعت تھی۔ ان کا تقویٰ بالاتر تھا۔ اللہ کے رسولؐ کی ان باتوں کو سنکر وہ سراپا خلوص اور احسان نافراموش انسان قرآن کی طرف بہت زیادہ متوجہ ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حافظِ قرآن سے بعد الحساب ارشاد فرمائے گا۔ اقرأ وارتق ورتل کما کنت ترتل فی الدنیا فانّ منزلک عند آخر آیۃ تقرأھا۔

اُذکما قال علیہ السلام۔ حافظ قرآن کی شفاعت اس کے خاندان کے دس مستحقینِ نار کیلئے مقبول ہوگی۔ ان ترغیبی روایات کو دیکھکر ہم صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی رغبت الی القرآن کا پوری طرح اندازہ قائم نہیں کرسکتے

مقطعات سے متعلق ایک بحث | جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ "مقطعات" کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، ان کے نزدیک اس سے امتحان مقصود ہے کیونکہ تکلیف کے معنی اصابتہ فی الکلفتہ کے ہیں۔ کلفت کبھی کام کرنے سے ہوتی ہے اور کبھی کام نہ کرنے سے اسی طرح بعضوں کو علم حاصل کرنے سے کلفت ہوتی ہے اور بعضوں کو فراوانیِ شوق کی وجہ سے علم کے حاصل نہ کرنے سے ایسے لوگوں کو رہِ طلب میں چلنے سے یہ کہکر روکدیا جاتا ہے کہ آگے نہ بڑھو اس کی تحقیق مت کرو!۔ دنیا کے اندر ایسے بھی شوقین حضرات موجود ہیں جو فرماتے ہیں، اگر جنت میں مطالعہ کے لئے ہمیں کتابیں دستیاب نہ ہوئیں تو ـــ وہ جنت در حقیقت ہمارے لئے جہنم نشاں بن جائیگی۔ ایسے لوگوں کو علمی تحقیقات سے روکنا اصل میں ان کا ابتلاء ہے۔ بخلاف ان بدشوق لوگوں کے جو علم سے کوسوں دور بھاگتے ہیں، گریز کرتے ہیں۔ انھیں تحصیلِ علم کا حکم کیا گیا۔ واما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تأویلہ الخ۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام حروف مقطعات سے واقف تھے یا نہیں؟۔ اگر جواب نفی میں ہے تب بھی کوئی استحالہ نہیں۔ کیونکہ ان کی پوزیشن صرف پیغام رسائی کی سی تھی انھیں اس سے کوئی بحث مقصود نہیں تھی کہ جو پیامات وہ من جانب اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیکر حاضر ہو رہے ہیں، ان میں کیا ہے؟ اور کس لئے ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام "راسخون فی العلم" میں سے ہیں۔ اور نیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مقطعات کا علم تھا۔ چنانچہ شیخ اکبر اور دوسرے اہل اللہ نے اسکی تفسیریں لکھی ہیں۔ اور بڑی طولانی۔ لیکن اس قدر پیچیدہ اور مبہم کہ ہماری فہم نارسا سے قطعی

طور پر باہر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حروف مقطعات کا ایک عام ہے اور ہر "ایک" دو کی حقیقت ہے اس کے اندر مختلف اثرات ہیں مثلاً میم کی حقیقت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے مشابہ ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے جمع کرنے سے ایک علیحدہ اثر رونما ہوتا ہے جیسے مختلف دواؤں کی آمیزش سے ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے، اسی کو ایمیا و سیمیا کہا جاتا ہے، یہ علم حروف ہے۔ مگر اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بخار والے کو چند حروف لکھکر دیدئے جاتے ہیں اور ان سے افاقہ ہوجاتا ہے۔ ٹھیک اسیطرح جیسے چند دواؤں کو ملاکر استعمال کرانے سے فائدہ ہوجاتا ہے۔

ایمیا و سیمیا و کیمیا کس نہ داند جز بساطِ اولیا

عود الی المطلب ہاں تو حق تعالیٰ نے "ذکر" کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محافظت کرائی حضور علیہ السلام نے خود قرآن کا دور جبرئیل علیہ السلام سے چوبیس مرتبہ کیا۔ لوگوں کو حفظ کی طرف زیادہ سے زیادہ شوق دلایا، قرآن کو لکھوا یا گیا۔ اس طرح سینے اور سفینے دونوں میں اس کی حفاظت کا اہتمام مکمل ہوگیا۔ آپ کے بعد شیخین کے قلب پر القاء ہوا اور پھر اس کے بعد زید ابن ثابت اور دوسرے جلیل القدر اور عظیم المرتبت صحابہ کے ذریعہ قرآن کو جمع کرا دیا گیا۔ ابوبکر صدیق رض کے دور میں جنگِ یمامہ ہوئی جس میں بہت سے حفاظ شہید ہوگئے تو اب خیال پیدا ہوا کہ اگر حفاظ یونہی شہید ہوتے رہے تو ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا، چنانچہ کاغذ کے پرچوں، اونٹ اور بکریوں کے شانوں کی ہڈیوں، درخت کے پتوں اور حافظوں کے سینوں سے قرآنِ حکیم کو کتابی صورت میں جمع کیا گیا، حضرت علی رض فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کے بارے میں سب سے زیادہ اجر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملیگا، کیونکہ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جسنے قرآن کو کتابی صورت دی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع شدہ قرآن کو با جماعِ صحابہ ترتیب دیا گیا اور ایک لغت یعنی لغتِ قریش پر جمع کیا گیا، اور سات نسخے تیار کرا کر

اسلامی ممالک میں بھیجے گئے تاکہ اس کے مطابق قرآن کی املاء کرائی جائے، اس طرح قرآن کی حفاظت مکمل ہو گئی۔ حضرت عثمان رضؓ کی وفات کے بعد لوگوں کی توجہ جمع حدیث کی طرف مبذول ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں احادیث کی جانب عام طور پر کافی میلان تھا، لیکن آپؐ اس میں انہماک سے روکتے تھے، منع کرتے تھے، مسلم کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے روکا، اس خوف سے کہ کہیں غلط بالقرآن نہ ہو جائے۔ دوسری طرف عبداللہؓ ابن عمرو بن العاص کو لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص کے پاس حدیث کا سب سے زیادہ ذخیرہ موجود تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ حدیث کا مالک ہوں، سوائے عبداللہ ابن عمرو بن العاص کے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایتیں پانچہزار تین سو چھتر ہیں، اس سے زیادہ روایتیں اوروں سے نہیں ملتیں عبداللہؓ ابن عمرو بن العاص کے متعلق مشہور ہے کہ یہ روایات کم کرتے تھے، تفقہ زیادہ، موصوف پر تصوف کا انتہائی غلبہ تھا۔ آپ کے والد محترم نے ایک بڑے گھرانے میں آپ کی شادی کر دی ابتدائے جوانی میں۔

کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دلہن سے عبداللہ کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کا معاملہ تمہارے ساتھ کیسا رہتا ہے؟ دلہن نے جواب دیا نعم الرجل عبداللہ الا انہ لم یطأ فراشا، حضرت عمرو رضی اللہ کو یہ سنکر حد درجہ ملال ہوا، لیکن انہوں نے جب عبداللہ سے معلوم کیا، تو عبداللہ نے کہا میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے دن میں روزہ رکھتا ہوں، رات میں قرآن پڑھتا ہوں، حضرت عمروؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بیٹے کی شکایت کی آنحضورؐ نے عبداللہ کو بلایا اور سمجھایا کہ اب سے ایسا کرو ایک مہینے میں تین دن روزے رکھو اور چالیس یوم میں ایک قرآن ختم کرو۔"

یہ سنکر جب عبداللہ رنجیدہ خاطر ہونے لگے، تو آنحضور علیہ السلام نے ازرہ تلطف صوم داؤد علیہ السلام (ایک روز کے وقفہ کے ساتھ) اور سات روز میں قرآن ختم کرنے کی اجازت

عطا فرمائی۔ بہرحال حضرت عبد اللہ پر چونکہ زہد کا غلبہ تھا اس لئے ہر شب میں ایک منزل سے کم نہ پڑھتے تھے، اخیر عمر میں حفظ و طاقت کے کم ہو جانے کے باعث بے انتہا افسوس کرتے تھے کہ کاش میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصت قبول کر لیتا!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کتابتِ حدیث شروع تو ہو گئی تھی۔ مگر خال خال مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس جو صحیفہ تھا اس میں دیت اور اونٹوں کے نصاب سے متعلق احکام مکتوب تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث کے لکھنے کا ارادہ کیا لیکن بذریعہ استخارہ تائید باری شاملِ حال نہ دیکھکر ارادہ ترک کر دیا۔ کتابتِ حدیث کا مسئلہ اول اول صحابہ میں مختلف فیہ تھا، بعض لوگ حدیث لکھتے تھے اور بعض منع کرتے تھے لیکن دورِ اخیر میں اتفاق رائے سے حدیث کی کتابت کا فیصلہ ہو گیا، مگر غیر مرتب طریقہ پر، یعنی اس میں تدوین و ترتیب ملحوظ نہ تھی بعد میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی طرف توجہ اور رغبت ہوتی گئی، خصوصاً جبکہ روافض و خوارج اور معتزلہ وغیرہ کے مہیب فتنے سر ابھارنے لگے۔ اس وقت اس کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی سنہ ۱۰۱ھ میں حضرت عمر ابن عبد العزیز مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے اپنی تمام قلمرو میں حکم نافذ کر دیا کہ احادیث لکھی جائیں، روایتوں کو مدوّن کیا جائے۔ مجامع میں کثرت سے پڑھی جائیں یہ اللہ کے نیک بندے اس کارِ خیر کے لئے ہمہ تن آمادہ ہو گئے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی محمد ابن شہاب زہری ہیں جنہوں نے اس کام کو شروع کیا۔ بعضوں نے کہا کہ سب سے پہلے عمر ابن عبد العزیزؒ کے حکم کی تعمیل کرنے والے محمد ابو بکر ابن حزم ہیں۔ بہرحال اس وقت سے، جمع کا کام شروع ہوا۔

عمر ابن عبد العزیز کی حکومت نہایت پر امن، نہایت پر سکون اور نہایت طمانینت بخش رہی ہے، آپ نے اپنے ملک کی گلی گلی اور کوچے کوچے کو عدل و انصاف سے بھر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں حق تعالےٰ کی وہ بے کنار رحمتیں نازل ہوئیں جن کا نظارہ آسمان کی آنکھ نے عمر ابن عبد العزیز کے بعد آج تک نہیں کیا۔ قصاب کہتے ہیں میں نے عمر ابن عبد العزیز کے دورِ خلافت میں بکریوں اور بھیڑیوں کو

ایک ساتھ چرتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے کہا سبحان اللہ عجیب بات ہے یہ سنکر چرواہا بولا جب سر اصلاح پر ہوتا ہے تو جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا" عمر ابن عبد العزیز کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو جعفر منصور نے دریافت کیا کہ جس وقت تمہارے والد خلیفہ ہوئے تو کیا آمدنی تھی؟ میں نے کہا چالیس ہزار دینار، انہوں نے پوچھا، اور انتقال کے وقت؟ میں نے جواب دیا چار سو دینار، اور اگر آپ اور زندہ رہتے تو اس میں بھی کمی کر دیتے" بعض عمال نے حضرت عمر ابن عبد العزیز کیخدمت میں خط لکھا کہ ہمارے شہر بہت خراب ہو رہے ہیں، اگر آنجناب حکم فرمائیں تو ہم کچھ مال علیحدہ کر کے ان کی تعمیر کرا دیں، خبر ہے عمر ابن عبد العزیز نے اس کا کیا جواب دیا؟ ۔غور سے سُنئیے!

آپ نے لکھا جس وقت تم میرا یہ خط پڑھو تو ان شہروں کے قلعے عدل سے بنا دو، اور ان کے راستے ظلم سے صاف کر دو! بس یہی اُن کی مرمت ہے۔ والسلام، بہرحال ۱۵۰ھ تک روایات جمع کی جاتی رہیں، لیکن ۱۵۰ھ کے گزرنے کے بعد جمع کردہ روایات میں ترتیب کا لحاظ بھی کیا جانے لگا۔ اول اول کیف ما اتفق جمع کا اہتمام ہوتا تھا۔ ترتیب ملحوظِ خاطر نہ تھی جیسے مؤطا امام مالکؒ مصنف عبد الرزاق کتاب المغازی لابن اسحاق،

تو معلوم ہوا کہ حدیث کے تین دور ہوئے ایک دور ۱۰۰ھ سے ۱۵۰ھ تک جس میں حدیثیں جمع کی گئیں۔ دوسرا دور ۱۵۰ھ سے ۲۰۰ھ تک جسمیں، ترتیب کا لحاظ کیا گیا۔ اب تک صحابہ و تابعین کے اقوال اور دوسرے علماء کے فتاویٰ اس کے اندر مخلوط تھے۔ موضوع کی کوئی خصوصیت نہ تھی، مؤطا امام مالکؒ اس کی بہترین نظیر ہے، تیسرا دور ۲۰۰ھ کے بعد کا ہے جسمیں یہ خیال پیدا ہوا کہ مرفوعہ، موقوفہ مقطوعہ روایات چونکہ خلط ملط ہیں اس لئے ایسی تصانیف ضروری ہیں کہ جنیں صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال یعنی مرفوعات کو جمع کیا جائے۔ اس کا احساس سب سے زیادہ امام بخاریؒ کو ہوا، چنانچہ انہوں نے تجرید کامل کا عزم مصمم کر لیا، اور سولہ سال کے عرصہ میں یہ کتاب جو آپ لوگوں کے سامنے ہے

(چھ لاکھ احادیث کا نچوڑ) تیار کر دی۔

امام بخاری ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش لفظ صدق سے وفات نور سے اور عمر حمید سے نکلتی ہے۔

مسلادہ صدق ومدة عمرہ ÷ فیہا حمید وانقضیٰ فی نورا

ان کا نام محمد، والد کا اسمٰعیل اور دادا کا نام ابراہیم ہے، اور پردادا کا نام مغیرہ۔ مغیرہ ہی سب سے پہلے اپنے خاندان میں مشرف باسلام ہوئے، ورنہ ان سے اوپر کے تمام لوگ بَردِزبہ پارسی تھے۔ امام بخاریؒ جُعفی کہلاتے ہیں وجہ یہ ہے کہ ان کے پردادا یعنی مغیرہ یمانِ جعفی والیٔ بخارا کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ اُسوقت اِس نسبت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جس دوران میں امام بخاریؒ پیدا ہوئے، بخارا علوم کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ بچپن ہی کے زمانہ میں بخاریؒ کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں نابینا ہو گئے۔ بعض لوگوں نے انھیں پیدائشی آنکھوں سے معذور بتایا ہے۔ ان کی والدہ بڑی نیک عابدہ زاہدہ تھیں۔ بخاری کی آنکھیں چلے جانے سے انھیں سخت افسوس تھا۔ بہر روتیں اور گڑگڑا گڑگڑا کر بارگاہِ ایزدی میں دعا مانگتیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بخاریؒ کے بصیر ہونیکی بشارت دے رہے ہیں، صبح اٹھکر دیکھا تو بخاریؒ کی دونوں آنکھیں منوّر ہیں امام ترمذیؒ بھی نابینا ہوئے، مگر اخیر عمر میں کثرتِ بکا کی وجہ سے۔ بخاریؒ کی طبیعت میں بچپن ہی سے ذکاوت اور تیزی تھی۔ دس سال کی عمر میں جب مکتب سے فارغ ہوئے تو ان کے قلب میں "حدیث" حاصل کرنے کا بے پایاں جزبہ پیدا ہوا یہاں تک کہ ہمہ وقت اسی دھن میں رہتے اور جہاں کوئی "حدیث" ملتی اسے فوراً یاد کر لیتے۔ داخلی نام کے ایک بڑے عالم ان کے محلہ میں رہتے تھے بخاریؒ نے دس سال کی عمر میں ان کے درس میں جانا شروع کر دیا۔ داخلی کے دوسرے تمام شاگرد قلم دوات اور کاغذ لیکر درسگاہ میں حاضر ہوتے تھے۔ لیکن بخاریؒ کے ہمراہ ان چیزوں میں سے ایک بھی نہ ہوتی تھی۔ طالبعلم ان کی طرف طنز کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مزاق اڑاتے تھے۔ حامد ابن اسمٰعیل جو اُن کے بالکل قریں تھے، کہتے ہیں کہ سولہ دن تک ہملوگ بخاریؒ کے ساتھ

یہی معاملہ کرتے رہے، کہ تم بھی کیا آدمی ہو ایسے ہی آکر بیٹھ جاتے ہو، بھلا ایسے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟ خواہ مخواہ اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہو! بخاریؒ نے یہ سنکر متانت سے کہا، اچھا بتاؤ سولہ یوم کے عرصہ میں آپ لوگوں نے کتنی حدیثیں لکھی ہیں؟ ہم نے کہا پانچ ہزار. بخاری بولے اچھا اپنی اپنی کاپیاں اٹھاؤ اور سنو! چنانچہ بخاریؒ نے پانچ کی پانچ ہزار حدیثیں زبانی سنا ڈالیں۔ یہ دیکھکر ہم ششدر رہ گئے اور اس قدر صحیح کہ ہمارے میں سے ہر ایک نے بخاریؒ کے حفظ پر مسودہ کی اصلاح کی، اور ہمیشہ کرتے رہے ۔ بخاریؒ کی گیارہ برس کی عمر ہے۔ داخلی استاد پڑھ رہے ہیں حدثنا سفیان عن ابی الزبیر عن ابراہیم النخعی بخاری برجستہ بولتے ہیں آپ نے غلط فرمایا ہے ابوالزبیر کی روایت ابراہیم نخعی سے نہیں ہے۔ داخلی کو یہ بات ناگوار گذری، لگے بخاری کو ڈانٹنے. لیکن بعد میں تنبیہ ہوا، فوراً گھر گئے اور اپنا صحیفہ دیکھا تو واقعی اپنی غلطی معلوم ہوئی داخلی نے بخاری کو قریب بلایا اور کہا اچھا بتاؤ صحیح بات کیا ہے؟ بخاریؒ نے جواب دیا صحیح یہ ہے عن الزبیر عن عدی عن ابراہیم. داخلی متحیر رہ گئے۔

امام بخاریؒ نے سولہ سال کی عمر میں تمام کتب متداولہ اور اساتذہ بخارا کی تمام روایات کو حفظ کر لیا علاوہ ازیں اور بھی بہت سی کتابیں ذہن نشین کر ڈالیں ۔ سولویں سال بخاریؒ اپنے بھائی احمد اور والدہ کی معیت میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے. حج سے فراغت کے بعد آپ کی والدہ اور بھائی واپس آ گئے لیکن بخاری مزید علم حاصل کرنے کی غرض سے وہیں مقیم رہے۔ مدینہ، شام اور دوسری جگہوں میں جہاں جہاں علم فراہم ہونے کا خیال ہوا وہیں وہیں پہنچے اور ممکن حد تک علم حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ نے تصنیفات کا سلسلہ چھیڑا اولاً صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی، اس سے آپ کی بڑی شہرت ہوئی۔ اس زمانہ میں آپ مکہ سے واپسی پر بغداد تشریف لے گئے وہاں کے لوگوں نے آپکا مثالی استقبال کیا۔ یہ بات وہاں کے علماء پر سخت گراں گذری اور جذبۂ حسد (جو کہ علماء میں خاص طور پر ہوتا ہے) پوری طرح ابھر آیا. بخاری رحمہ اللہ

جب ایک بھرے مجمع میں تشریف لائے تو سوچی ہوئی اسکیم کے تحت دس عالموں نے دس دس حدیثیں متن و سند میں تبدیلی کے ساتھ پیش کیں، بخاریؒ نے کہا "لا اعرف"، مجمع میں جو پڑھے لکھے اور سنجیدہ لوگ تھے وہ سمجھ گئے کہ بخاریؒ حقیقت سے ہم آشنا ہیں۔ مگر جہاّل نے انھیں ناواقف گردانا۔ لیکن بعد میں جب بخاریؒ نے ایک ایک حدیث کی تصحیح فرمائی تو سب پر بخاریؒ کا مقام واضح ہوگیا اور ہر ایک کو آپ کی عظیم الشان قابلیت کا لوہا تسلیم کرنا پڑا۔ فربری بخاری کے شاگرد ہیں کہتے ہیں کہ استاذ محترم نے فرمایا "احفظ مأۃ الف حدیث صحیح و مأۃ الف غیر صحیح"۔

اس کتاب کے اندر سات ہزار دو سو چھیتر حدیثیں ہیں، ان میں مکررات بھی شامل ہیں، چونکہ ایک حدیث سے مختلف مضامین ثابت ہوتے ہیں اس لئے اسے مکرر لایا گیا ہے یہ تکرار باعتبار ظاہر کے ہے ویسے در حقیقت یہ تکرار نہیں۔ خود بخاریؒ کہتے ہیں کہ "میرا مقصد مکررات سے بچنا ہے"۔

بخاری کی وجہ تصنیف

مصنفؒ نے اس کتاب کی تصنیف کیوں کی؟ اس کے متعلق متعدد باتیں کہی جاتی ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ ایکروز بخاری اسحاق ابن راہویہ کے درس میں بیٹھے ہوئے تھے کسی نے کہا کہ صحاح کو غیر صحاح سے متمیز کرنیکا علم ہم عوام کو نہیں اس لئے ایسی کتاب ہونی ناگزیر ہے جسمیں صرف صحاح کو جمع کیا جائے اور بعضوں نے کہا کہ بخاریؒ نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریں ہوں اور آپؐ سے مکھیاں اُڑا رہا ہوں، کسی بڑے عالم سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی، تو انہوں نے بتایا کہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیجانب سے کذب کی نسبت دور کروگے۔

بخاری کی تصنیف کی بابت بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بخاریؒ نے خواب میں دیکھا کہ حشر قائم ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لارہے ہیں، بہت سے لوگ آپؐ کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں، ان میں، میں بھی شامل ہوں اور دوسروں کے برخلاف آپؐ کے قدموں کے نشانات پر پاؤں رکھ رہا ہوں، چنانچہ اس خواب کی تعبیر کے طور پر امام بخاریؒ

نے یہ کتاب تصنیف فرمائی ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لوکان الدین عند الثریا لنال رجال من ابناء فارس اس حدیث کا مصداق سب سے پہلے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور پھر امام بخاریؒ، اور پھر خواجہ حبیب عجمیؒ یہ اہل طریقت میں بڑے درجہ کے آدمی ہیں شاہ عبد القادر صاحب جیلانی کے سلسلہ میں ان کا نام آتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ واٰخرین منہم لما یلحقوابہم کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں۔ آپؐ نے فرمایا رجال من ابناء فارس۔ بہرحال یہ روایتیں صحیح وقویہ ہیں امام بخاریؒ بھی ان کے مصداق ہیں۔

بخاریؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے حیرت انگیز کمالات عطا فرمائے کہ وہ بچپن ہی سے علم حدیث کا مرکز بن گئے، غالباً سفیان ابن عیینہ یا اسحاق ابن راہویہ کا واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں ذکر آیا عن العطاء الکیخارانی اسحاق نے امام بخاری سے پوچھا ای شئی کیخاران؛ بخاری نے جواب دیا کیخاران یمن میں ایک گاؤں ہے، وہاں ایک صحابی کو حضرت معاویہؓ نے بھیجا تھا عطا نے وہاں جاکر دو حدیثیں ان سے سنی ہیں۔ یہ سنکر تمام حاضرین مجلس بڑے متعجب ہوئے۔ آج جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ہی جیسا چوہے کا حافظہ اُن لوگوں کا بھی ہوگا۔ بخاریؒ کا امتحان اہل بغداد نے لیا واقعہ گذر چکا ان تمام باتوں سے بخاریؒ کے حافظہ کی انتہائی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بخاری میں تراجم ابواب بمنزلِ دعاوی کے ہیں اور بعد کی روایات دلائل کے مرتبہ میں۔ تراجم ابواب بخاری نے مکہ میں طواف اور رکعتین طواف ادا کرنے کے بعد اور کچھ تراجم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر مراقبہ کے بعد مابین المحراب المنبر لکھے ہیں مصنفؒ ہر حدیث کے لکھنے سے پہلے غسل کرنا اور دو رکعت نماز پڑھنا ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت مصنفؒ نے نوے ہزار طلباء کو اس کتاب کی تعلیم براہ راست دی ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو کسی سے چھوٹا نہیں پایا۔ مگر علی ابن مدینی سے ، علی ابن مدینی نے یہ سنکر کہا ذرہ فانہ لم یر مثلہ احداً۔

امام احمدؒ کہتے ہیں خراسان کی زمین نے چار شخص پیدا کئے ہیں جن کی نظیر نہیں، بخاری، مسلم، ابوذرعہ
امام وسوقی، بخاری کے مناقب حقیقت یہ ہے کہ ہمارے احاطۂ بیان سے باہر ہیں۔ دوسرے
اہل علم حضرات کیطرح بخاریؒ کو بھی مہیب خطروں سے گذرنا پڑا ہے، طرح طرح کے فتنے پیش
آئے ہیں خالد ابن احمد ذہلی (والئی بخارا) نے امام موصوف سے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ
آپ ہمارے مکان پر تشریف لاکر اپنی جامع اور کتاب التاریخ ہمارے بچوں کو پڑھایا کریں،
(ایک روایت میں ہے کہ خالد خود سننا چاہتا تھا) بخاریؒ نے جواب دیا "تمہارے مکان
پر حاضر ہوکر پڑھانا مجھے منظور نہیں اس میں علم کی توہین ہے،، خالد نے کہا اچھا خود ہمارے
بچے آپ کے مکان پر آیا کریں گے، لیکن ــــ اس شرط پر کہ اس اثنار میں دوسرے طالبعلم
نہیں آسکتے، میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میرے بچے نیچے طبقہ کے بچوں کی ساتھ بیٹھکر پڑھیں
بخاریؒ کے پیش نظر چونکہ بڑے اور چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں تھا اس لئے خالد کی یہ بات بھی
رد کردی گئی، خالد سے اب برداشت نہ ہو سکا، برہم ہو گیا، یہانتک کہ اس نے بخاریؒ کے
خلاف نہایت کمینہ سازشیں شروع کردیں۔ وہ قانون کی زد میں لاکر امام بخاریؒ کو سخت سزا
دینا چاہتا تھا چنانچہ وہاں کے حریث ابن ابی ورقہ اور دوسرے خود فروش علمار نے اس کی
یہ خواہش بھی پوری کردی۔ چند سکوں اور کچھ عہدوں کے عوض ان لوگوں نے بخاریؒ پر من ملنے
اعتراضات کئے، اور پھر ان کو تحریری شکل میں لاکر خالد کے روبرو پیش کیا اور کہا کہ بخاری مبتدع
ہوگئے، ضال ہوگئے۔ گمراہ ہو گئے ان کو جلد از جلد شہر سے باہر نکال دیا جائے۔ خالد اپنی
کامیابی پر بہت خوش ہوا اور امام کو جلا وطن کر دیا۔ امام بخاریؒ نیشاپور تشریف لے گئے، مگر
وہاں کے والی نے بھی عداوت شروع کردی، آخر کار بخاریؒ نے خرتنک کی راہ لی (یہ سمرقند
کے قریب ایک گاؤں تھا) جلا وطنی سے آپ کو بڑی تکلیف پہنچی، آپ نے دعا کی یا اللہ میں فتنوں
سے تنگ آگیا ہوں، مجھے نجات دیجئے۔ اس کے ایک ماہ بعد ۲۵۶ھ اور عید الفطر کی شب
میں آپ کی وفات ہو گئی جس وقت امام بخاریؒ کو دفنایا گیا تو ایک عجیب قسم کی خوشبو زمین

سے نکلی اور قبر کی تمام مٹی میں مل گئی، اور وہ مٹی مستقل شفار کا کام انجام دینے لگی، ضرورت مند اُٹھا اُٹھا کر لیجانے لگے، بارہ تیرہ مرتبہ قبر بند کی گئی ولبعد ذلک ایک بزرگ کی دعا پر وہ خوشبو ختم ہو گئی۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہما خاکم کہ ہستم!

بخاریؒ کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد بخارا میں سخت فتنے جاگ اُٹھے، حتیٰ کہ خالد بد کردار کو گرفتار کر لیا گیا، اور کالا منہ کر کے گدھے پر بیٹھا کر شہر گشت کے بعد خلیفہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ دوسرے وہ تمام علمار بھی جن کی ناپاک سازش سے بخاریؒ کے ساتھ جلا وطنی کا معاملہ کیا گیا تھا، مصائب میں بُری طرح مُبتلا ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان "من اذیٰ لی ولیًا فقد اٰذنتہ بالحرب،، پورا ہو کر رہا۔ عبدالواحد طوسی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرما ہیں، میں نے ادب سے سلام کیا اور جرأت سے دریافت کیا آپؐ یہاں کیسے؟ فرمایا، انتظر محمد ابن اسمٰعیل،، بعد میں معلوم ہوا کہ ٹھیک انھیں ساعتوں میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا اولاً چونکہ قدرت کو فقہ کی تکمیل مقصود تھی اس لئے امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد ابن حنبل وغیرہ جیسے محققین کو پیدا فرمایا۔ ان مخلص حضرات نے احادیث سے مسائل کے استخراج میں لا محدود کوششیں صرف کیں۔ امام ابو حنیفہ ۸۰ھ میں امام مالک ۹۰ھ میں امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے امام احمد ابن حنبل کی پیدائش امام شافعیؒ سے بعد کی ہے، تابعین کا دور ختم ہونے سے پہلے پہلے یعنی ۲۰۰ھ سے قبل تمام ائمہ کی فقہیں مرتب ہو چکی تھیں۔ مگر ۵۰۰ھ تک صرف چار مسلک معمول بہ رہ گئے۔

حضرات صحابہؓ میں سے بھی بعض نے فقہ کی طرف کافی توجہ کی۔ ابن مسعود، عائشہ صدیقہ زید ابن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اسمائے گرامی اس سلسلہ میں خاص طور پر لئے جاتے ہیں، حضرت عمرؓ نے ابن مسعودؓ کو اہل کوفہ کی تعلیم کے لئے کوفہ بھیجا اور فرمایا اے اہل کوفہ میں ابن مسعودؓ کی فقہ کا زیادہ محتاج تھا، لیکن میں نے اپنے اوپر تم لوگوں کو

ترجیح دی۔

ابن مسعودؓ پانچویں یا چھٹے مسلمان ہیں، اس وقت سے ہمیشہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ ستر سے زیادہ سورتیں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ پڑھی ہیں۔ حضورؐ فرماتے تھے اگر کوئی قرآن منزل پڑھنا چاہتا ہے تو چاہیئے کہ ابن مسعودؓ سے پڑھ لے۔ ایک مجلس میں آپؐ نے فرمایا جس بات کو ابن مسعودؓ امت کے لئے پسند کریں وہ مجھے بھی پسند ہے۔ دراصل حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا تفقہ خلفائے اربعہ کے بعد سب سے بڑھکر ہے فزوں تر ہے۔ ابن مسعودؓ کے دو شاگرد ہیں اسود اور علقمہ۔ پھر ان کے شاگرد ابراہیم نخعی ہیں اور ابراہیم نخعی کے شاگرد حماد ابن ابی سلیمان ہیں اور حماد ابن ابی سلیمان کے شاگرد ابوحنیفہ ہیں، فقہ حنفی کی بنیاد چار افراد پر قائم ہے ابن مسعود عمر عائشہ علی رضی اللہ عنہم۔ کہا جاتا ہے کہ فقہ کو بویا ابن مسعودؓ نے سیراب کیا اسود اور علقمہ نے اور کاٹا ابراہیم نے اسے پیسا حماد نے، گوندھا ابوحنیفہ نے، اور پکایا امام محمد ابن الحسن نے اور ـــــ بعد کے تمام لوگ تناول فرما رہے ہیں۔

فقہ کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے احادیث کا انتظام کرایا یعنی احادیث رسول کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کیا گیا۔ اس کے لئے تدوین حدیث سے متعلق گذری ہوئی تفصیل کافی ہے۔ اگرچہ تدوین حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے شروع ہوچکی تھی، لیکن زیادہ تر توجہ روایت کی حیثیت سے نہ تھی، بلکہ درایت کے اعتبار سے تھی، اور باقاعدہ سند و متن سے متعلق توجہ ۲۰۰ھ کے بعد سے شروع ہوئی اور یہ سلسلہ ۳۰۰ھ کے کچھ بعد تک بڑے اعلیٰ پیمانے پر جاری رہا۔

امام بخاریؒ نے روایت حدیث پر زیادہ کام کیا۔ سند و متن سے متعلق بخاریؒ نے نہایت عمدہ اور مفید مباحث بیان کئے ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے درایت کی طرف بھی کافی توجہ مبذول فرمائی ہے مگر کتاب میں اکثر توجہ روایت کیطرف ہے۔ امام مسلمؒ درایت

کی طرف توجہ امام بخاریؒ سے کم کرتے ہیں بخاری نے سولہ سال کی مدت صرف روایات ہی میں خرچ نہیں کی، بلکہ استنباطِ مسائل میں بھی کافی وقت لگایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری میں تراجم ابواب سب سے زیادہ سخت اور مشکل ہیں۔ تراجم ابواب پر مستقل کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ شراح حدیث سے بہت سی جگہ اس میں عجز بھی پیش آیا ہے، اسی باعث یہاں تراجم ابواب سے زیادہ بحث کی جاتی ہے، اور ترمذی میں فقہی مسائل پر زیادہ زور ہوتا ہے کیونکہ صاحب ترمذی نے اس کی جانب بڑی توجہ کی ہے، تراجم ابواب سے قوت اجتہاد پیدا ہوتی ہے اور استخراج مسائل کا طریقہ دریافت ہوتا ہے، روایت کے واسطے اصل مقصود تو متن ہے لیکن بالواسطہ اسناد سے بحث ہوتی ہے۔ اس کتاب کی تین سندیں ہیں پہلی سند تو وہ ہے جو مجھ سے حضرت شاہ ولی اللہ تک گئی ہے۔ دوسری سند شاہ صاحب سے امام بخاری تک ہے اور تیسری سند امام بخاریؒ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہے۔ مصنفؒ صرف اس سلسلہ کی صحت کا متکفل ہے، اسے متن کی صحت وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں محض رُوات کی عدالت کا اور دوسرے ان صفات کا جو سند سے متعلق ہیں حاصل ہونا صحیح کیواسطے ضروری ہے۔

صحیح کے لئے پانچ شرطیں ہیں راوی کا عادل ہونا: تام الضبط ہونا۔ سند کا متصل ہونا۔ علت سے خالی ہونا۔ شذوذ سے خالی ہونا۔ اگر سند کے اندر کوئی راوی ضبط میں ناقص ہے تو روایت صحیح کے درجہ سے گر جائے گی۔

بخاری کی چند روایات کے متعلق دارقطنی اور بعض دوسرے لوگوں نے کلام کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی مقدمۂ فتح الباری میں اس کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ میں نے اس کتاب کو دو مرتبہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ہے اور پھر مولانا خلیل احمد صاحب سے، وبعد ذالک علمائے حرمین سے اس کی سند حاصل کی۔ حضرت شیخ الہند سے یہ کتاب اولاً ۱۳۱۵ھ میں پڑھی اور ۱۳۱۶ھ میں عازم حج "بیت اللہ" ہوا۔ وہاں سے

۱۳۲۶ھ میں ہندوستان کی طرف مراجعت کی مدینہ کے قیام کے زمانہ میں صحاح ستہ اور دیگر فنون کی کتابیں پڑھانے میں آئیں، بایں وجہ مسائل کا کافی استحضار ہو گیا۔ مدینہ منورہ میں پڑھاتے ہوئے بعض ایسے مسائل پیش آئے جنھیں میں حضرت شیخ الہند صاحب سے حل کرنے کا آرزومند تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں مجھے کوئی بڑا عالم نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ ۱۳۲۶ھ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر بخاری و ترمذی دوبارہ پڑھیں۔ پھر چونکہ مجھے علم کلام اور دوسرے علوم میں کچھ درک تھا اس لئے حضرت موصوف سے استفادہ کا خاطر خواہ موقع ملا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پڑھا اور اجازت مولانا گنگوہی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور مولانا احمد علی سہارنپوری سے حاصل کی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھا جو کہ دہلی میں اپنے زمانہ میں علم حدیث اور تصوف میں بڑے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ شاہ مجددی موصوف نے شاہ اسحاق سے پڑھا جو شاہ اسمٰعیل کے نواسے تھے، اور بہت اونچے محدث تھے، شاہ اسمٰعیل کے تلامذہ یوں تو بے شمار تھے لیکن استفادہ شاہ اسحاق کو نسبتہً زیادہ ہوا۔ شاہ عبدالغنی صاحب ہجرت کر گئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز (جو کہ شاہ اسحاق کے استاذ ہوتے ہیں) نے مکمل تعلیم حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے حاصل کی۔ اور شاہ ولی اللہ نے دیارِ حرم کی اس پاک سرزمین سے علم نبوی حاصل کیا تھا جسکا ایک ایک ذرہ رفعتوں کا امین ہے۔ آپ کے مشہور استاذ شیخ ابو طاہر مکی ہیں ہماری خصوصی سند کے اوپر تمام سندیں لکھی ہوئی ہیں پس اس کی جانب رجوع کیجئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الوحی

باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ باب اس بیان میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی ابتداء کس طرح ہوئی اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ نے کہا، ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی جیسی کہ نوح علیہ السلام اور ان کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف بھیجی تھی۔ علقمہ ابن وقاص اللیثی سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے منبر پر سنا کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے، بلاشبہ اعمال کا اعتبار نیتوں پر موقوف ہے۔ اور بے شک ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی پس جس شخص نے دنیا کو حاصل کرنے کی نیت سے ہجرت کی یا عورت سے نکاح کرنیکی نیت سے ہجرت کی، تو اس کی ہجرت الی ماھاجر الیہ کیطرف ہو گی [علہ]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے شروع میں "حمدلہ" کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ روایت میں حمدِ خدا کے ابتداء میں نہ ہونیکو نامحمود کہا گیا ہے۔ خطباء میں سے جب کسی نے بغیر "حمدلہ" علی عادت العرب خطبہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بئس الخطیب انت۔ اس لئے امام بخاریؒ پر اشکال وارد ہوتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث چونکہ شرائطِ بخاری پر پوری نہیں اترتی درجہ صحت سے گری ہوئی ہے اس وجہ سے بخاریؒ نے اسے معمول بہ نہیں گردانا۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حدیث میں لفظ حمد کی کتابت تو ضروری نہیں ہے، ہو سکتا ہے امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب شروع کرتے وقت حمدِ خدا زبان سے ادا کر لی ہو۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ "حمد" الوصف بالجمیل کو کہتے ہیں صرف "بسملہ" اس کے لئے کافی ہے، اس سے دونوں روایتوں یعنی روایت بسملہ اور روایتِ حمدلہ سے سمجھئے کہ ابتداء ہو گئی۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ

علہ یہ نشانِ ترجمہ ہے تمام کتاب میں اس کا خیال رکھا جائے، تقریر اس کے پیچھے سے شروع ہوتی ہے۔ ک

اقرار باسم ربک ابتدا میں نازل ہوئی اور اس کے تین سال کے بعد سورہ مدثر کا نزول ہوا. لیکن ایک میں بھی "حمدلہ" موجود نہیں. اس سے معلوم ہوا کہ وہ روایت اس درجہ کی نہیں جس پر عمل کرنا ناگزیر ہو. مصنفؒ نے کتاب اللہ کی اقتدار کرتے ہوئے اپنی کتاب "بسملہ" سے شروع کی "حمدلہ" سے نہیں. پانچواں جواب یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے صلح حدیبیہ میں جب معاہدہ کی کتابت کی تو اس میں حمدلہ نہ تھی، چھٹا جواب یہ ہے کہ مصنفؒ نے اپنی دوسری تصانیف کی طرح یہاں بھی "حمدلہ" لکھی تھی، لیکن ناقلین سے وہ الفاظ رہ گئے، حمدلہ کو مصنف نے از خود ترک نہیں کیا اس لئے کہ اگر امام بخاریؒ قصداً ترک کرتے تو آپ کی دوسری کتابوں میں بھی "متروک ہونی چاہیئے تھی. حالانکہ وہاں موجود ہے.

یہ چھ مختلف جوابات دئے گئے ہیں. لیکن سب سے عمدہ اور اچھا جواب یہ ہے کہ مصنفؒ یہاں وحیِ الٰہی کی اقتدار کر رہے ہیں. ہم آگے چلکر بیان کریں گے، کہ مصنفؒ نے کن وجوہ کی بنا پر "بدأ وحی" سے کتاب کی ابتدار کی. وہاں تعلیل کی تفصیل ہوگی. جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہوں کے نام خطوط تحریر فرماتے ہیں جنہیں انھیں اسلام کی دعوت دی گئی ہے، مثلاً شاہ حبشہ کے نام. قیصر روم کے نام. کسریٰ فارس خسرو پرویز کے نام. شاہ ہرمزانکے نام. عزیز مصر مقوقس کے نام. ہوذا ابن علی شاہ یمامہ کے نام. حارث ابن ابی شمر غسانی شاہ دمشق کے نام. ان مکتوبات میں "بسملہ" کا تذکرہ تو ہے لیکن "حمدلہ" کا نہیں مصنفؒ نے اسی کی تقلید کی اور ابتدار "بسملہ" سے مناسب سمجھی.

باب مصنفین کی عادت ہے کہ جب وہ کسی جگہ چند مسائل بیان کرتے ہیں تو عنوان کے طور پر وہاں باب. فصل. یا کتاب کے الفاظ بولتے ہیں. لفظِ کتاب مسائل مختلف الانواع کیلئے بولا جاتا ہے جیسے کتاب الطہارت، اس لئے کہا جائے گا کہ لفظِ کتاب جنسِ منطقی کے درجہ میں ہے. اور لفظِ باب متحد الانواع مسائل پر بولتے ہیں جیسے باب الوضو اور لفظِ فصل متحد الصنف مسائل کے لئے آتا ہے. لفظِ باب تشبیہاً لباب البیت بولا جاتا ہے، اور کبھی کتاب باب کی جگہ اور باب کتاب کی جگہ بھی استعمال کرتے ہیں. مصنفؒ کو چونکہ یہاں نوعِ وحی سے

متعلق مسائل کا تذکرہ مقصود ہے اس لئے باب کا لفظ بولے ہیں. کیف یہ مضاف الیہ کی، کیفیت کے استفہام کے لئے آتا ہے. بدایت وحی کی کیفیات کی تفصیل اس باب میں آئے گی بدؤ ہو سکتا ہے یہ مہموز اللام ہو اور اس کے معنی ابتداء کے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ معتل اللام ہو اور بدو کے معنی ظہور کے ہوں. بہر حال دونوں نسخے موجود ہیں پہلی کی بنا پر معنی ہوں گے کہ بدایت وحی کن کیفیات کے ساتھ ہوئی. اور دوسرے نسخے کی صورت میں تفصیل یہ ہوگی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ قریب آیا تو آپ لوگوں سے دامن کشاں رہنے لگے، گریز کرنے لگے اور آپ کی طبیعت زیادہ تر تنہائی پسند ہو گئی. سب جانتے ہیں کہ انسان فطری طور سے مادیات کی طرف مائل ہوتا ہے. مگر جب کوئی انسان خدا کی نظروں میں محبوب ہو جاتا ہے، تو ــــ اللہ تعالیٰ اُسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز بنا کر اپنی جانب رجوع کر لیتے ہیں یہی صورتِ حال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آئی. آپؐ کو رویائے صالحہ کے ذریعہ عالم مجرد کے واقعات سے مطلع کیا جانے لگا. اور یہ رفتہ رفتہ ہوا، نجماً نجماً ہوا. اچانک اور دفعۃً ایسا نہیں کیا گیا. کیونکہ انسان کی مادیت اس تجردِ محضہ کو بلاتدریج و آہستگی قبول نہیں کر سکتی. جناب حق تعالیٰ کے یہاں عموماً تربیت کا یہی طریقہ ہے. چنانچہ عالم کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے اس طریق کی مظہر ہے. اسی سنت کے مطابق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بتدریج عالمِ علوی کی طرف راغب کیا گیا ہے. حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ شاہد ہے، آپ نے پہلے نجم کو دیکھا پھر قمر کو، اور پھر آفتاب پر غور و فکر کیا اس کے بعد کہیں جا کر معبودِ حقیقی کی جانب پہنچے. واقعہ یہ ہے کہ جو کام تدریجاً ہوتا ہے اس میں بقا ہوتی ہے مداومت ہوتی ہے. حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام کو زمانہ طفولیت ہی میں نبوت ملی، تدریجی طور سے نبوت کے مراحل طے نہیں کرنے پڑے. اسلئے ان کے فضائل ابراہیم علیہ السلام کے درجہ کو نہیں پہنچ سکے. مذکورہ بالا تفصیل کی بنا پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے رویائے صالحہ سے نوازا گیا. غائب کی چیزیں دوزخ و جنت وغیرہ خواب میں دکھلائی گئیں. چھ ماہ تک مسلسل یہی حال رہا فبعدہٗ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

بیوی بچوں اور احباب و اقارب سے بسا اوقات علیحدہ رہنے لگے، آپؐ نے یکسوئی وخلوت نشینی اختیار کرلی حتیٰ کہ غارِ حرا میں وحی نازل ہوئی، اور اس کے بعد فترت وانقطاع کا زمانہ پیش آیا جو برابر تین سال تک باقی رہا۔

الوحی وحی لغۃً الاعلام خفیۃً کو کہتے لیکن اصطلاح میں اس کے معنی ہیں اعلام اللہ تعالیٰ انبیاءہ کتاباً او رسولاً او الہاماً او نوماً۔ الیٰ رسول اللہ رسول کیوں کہا گیا نبی کیوں نہیں کہا، رسول اور نبی میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے، رسول کے اندر امر بالتبلیغ یا اوتی بکتاب کی قید لگائی جاتی ہے اور جا [illegible] نہیں۔ نبی کے پاس بلاشبہ وحی آتی ہے، لیکن وہ کبھی مامور بالتبلیغ ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا [illegible] لئے معلوم ہوا کہ رسول کا لفظ نبی کے لفظ سے زیادہ اونچا اور اہم ہے، رسول کو شریعت [illegible] مستقلہ دی جاتی ہے اور نبی اس سے محروم رہتا ہے۔ مگر حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کے ساتھ ساتھ خلعتِ نبوت سے بھی سرفراز فرمایا ہے۔ نبی نبأٌ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی اخبار کے ہیں اور نبیٌ مُخبِر یا خبیر کے معنی میں ہے جیسے قتیل کے معنی قاتل اور مقتول، دونوں کے آتے ہیں۔ آپ کو کتاب بھی دی گئی اور شریعتِ مستقلہ بھی عطا کی گئی۔ رسول اللہ اگرچہ عام لفظ ہے لیکن درحقیقت اس جگہ مخصوص ہے رسول بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ بھی ہیں۔ لیکن یہاں وہ حضرات مراد نہیں۔ اضافت کی چار قسمیں ہیں جس طرح الف لام چار وجہوں کے لئے آتا ہے اسی طرح اضافت بھی چار معنوں کے لئے آتی ہے۔ اسجگہ اضافتِ عہد خارجی ہے اور "رسول اللہ" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی الیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاں بھی نام آئے خواہ بالعلم ہو خواہ بالصفت اور خواہ بالکنایہ وہیں، آپؐ پر درود بھیجنا ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ دوسری طرف خود حضور کا ارشاد ہے کہ بخیل کامل وہ ہے جس کے سامنے میرا تذکرہ آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے، درود ہر مرتبہ یعنی جتنی مرتبہ آپ کا نامِ مبارک آئے، بھیجنا چاہیئے! لیکن مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ کم از کم اس مجلس میں ایک بار تو درود ضرور ہی بھیجنا چاہیئے، صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ اگرچہ جملہ خبریہ ہے لیکن، یہاں انشائیہ ہے۔ کیونکہ اس سے یہاں انشاء ہی مراد ہے۔ " باب کیف کان بدأ الوحی" میں مراد سوال نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے باب جواب کیف کان بدأ الوحی۔ یعنی اس میں سوال کیف کان بدأ الوحی کا جواب دیا گیا ہے۔ لفظ باب کے اندر تین احتمال ہیں ایک یہ کہ بابْ منقطع ہو، اس صورت میں اسپر کوئی اعراب نہیں آئیگا، سکون رہے گا۔ دوسرا یہ کہ باب خبر ہو مبتدا محذوف کی، اس صورت میں اس پر تنوین آئیگی جیسے ہذا بابٌ۔ تیسرا احتمال ہے کہ باب مضاف ہو کیف کان کی طرف۔ اس صورت میں اسے مرفوع پڑھیں گے۔ جیسے بابُ کیف کان۔ یہی طریقہ تمام کتاب میں آتا رہے گا ــــ یہاں تک مفردات کی تفسیر تھی۔ اب میں اس جملہ مرکبہ اور ترجمۃ الباب کے مقصد کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ مصنفؒ نے یہاں تمام کتب سے الگ ہوکر ایک نئے ڈھنگ پر اپنی کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ بہ ظاہر تو مناسب تھا کہ امام مسلم کی طرح مصنفؒ بھی پہلے کتاب الایمان لاتے۔ پھر یہ کہ مصنفؒ نے جب یہاں وحی کو شروع کیا تھا۔ تو ضروری تھا کہ اس سے متعلق تمام مسائل پر یہیں بحث کرتے۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف ان تمام ابواب کو جلد ثانی میں پیش کیا ہے۔ صاحبِ عقائد نسفی کہتے ہیں کہ اسباب العلم ثلٰثۃ الحواس السلیمہ والعقل والخبر الصادق۔ اس عبارت کے اندر عقل کو جو ممیز ہے اور حس کو جو مدرک اشیائے محسوسہ ہے۔ اور تیسرے خبر صادق کو اسباب علم بتایا گیا ہے۔ خبر صادق کی دو قسمیں ہیں خبر متواتر اور وحی بایں طور چار چیزیں اسباب علم میں سے ہوئیں اور ان سب میں وحی زیادہ قوی ہے۔ حس اس وقت صحیح ادراک کر سکتی ہے جبکہ قوت حاسہ درست ہو۔ یرقان والے کا ہر چیز کو زرد دیکھنا، صفراوی کا میٹھے کو تلخ سمجھنا، بلغمی کا نمکین کو پھیکا خیال کرنا یہ ساری چیزیں قوت حسیہ کے مدرکِ ناقص ہونیکی واضح دلیلیں ہیں اور قوائے عقلیہ کی غلطیاں تو ہر کہہ ومہہ پر عیاں ہیں ہی! کوئی العالم قدیم کہکر استغنائے عالم کی دلیل پیش کرتا ہے۔ کوئی حدوث عالم کا قائل ہے اور تغیر عالم سے استدلال کرتا ہے۔ کوئی الجسم مرکب من الہیولی والصورت پر یقین رکھتا ہے اور کوئی الجسم مرکب من اجزاء التی لاتجزی کا قائل ہے اور کسی نے من اجزائے ذی مقراطیسیہ کہا ہے زمانہ قدیم میں فیثاغورث

ارسطو نے نظریہ قائم کیا کہ دنیا کے اندر جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں، ان سب میں صرف چار عناصر کار فرما ہیں. آگ. پانی. مٹی. ہوا. بعد کے آنے والے عرب حکمائے نے عناصر اربعہ کے ساتھ عناصر ثلثہ، گندھک. پارہ. نمک کا اور اضافہ کیا — انیسویں صدی میں عنصروں کی تعداد ۹۲ تک پہنچ گئی اور اب موجودہ سائنس داں متقدمین کے چار عناصر کے بجائے عناصر کی تعداد ۹۹ مانتے ہیں اگر ہم فیثاغورث اور ارسطو کے نظریہ پر یقین کر بیٹھتے تو حکمائے عرب کا نظریہ اسے جھٹلا دیتا ختم کر دیتا، اور بعد میں یہی حشر حکمائے عرب کے نظریہ پر یقین کرنیکا ہوتا. علی ہذا القیاس!

معلوم ہوا کہ تنہا عقل افادۂ علم ویقین کے لئے کافی نہیں ہے. ایسے ہی روح کے متعلق حکماء کے سو اقوال ہیں. عقل صحیح بلاشبہ ادراک کرتی ہے، لیکن اس کے ادراک میں قوتِ واہمہ حائل ہو جاتی ہے اس لئے اس کا ادراک ہر مسئلہ میں ہماری صحیح رہنمائی نہیں کر سکتا. بلکہ بسا اوقات قوتِ واہمہ کا زور صحیح راستہ سے بھٹکا دیتا ہے اور عقل ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے.

تیسری چیز خبر متواتر ہے. اس کے منتہا کو دیکھا جائے گا کہ وہ حقیقت میں امرِ محسوس ہے یا نہیں، جیسے آپ سنتے ہیں کہ واشنگٹن ایک بہت بڑا خوبصورت شہر ہے اور اس کا ثبوت کسی کے آخیر میں دیکھنے پر بہم پہنچا ہے، قابل اعتبار ہے. معلوم ہوا کہ جو خبر متواتر اپنا منتہا امر محسوس رکھتی ہے وہ معتبر ہے. اور جس کے اندر منتہا امر محسوس نہیں ہے، وہ قابلِ اعتماد نہیں گردانی جائیگی جیسے کوئی کہے کہ عالم کا قدیم ہونا بذریعہ تواتر ارسطاطالیس سے ثابت ہے، چوتھے نمبر پر وحی ہے. یہاں ہمارے سامنے ایک مکمّل زندگی آتی ہے جس نے اپنی سچائی کو خوارقِ عادات سے ثابت کر دکھایا ہے خوارق عادات سے مراد ایسے معجزات ہیں جو اس ظاہر کرنے والے کی طاقت سے باہر ہیں، مادری ہیں مثلاً چاند کا شق ہونا، کنکری کا کلمہ پڑھنا وغیرہ، ان امور کا اظہار اس بات کو بتا رہا ہے کہ واقعی یہ پیکرِ صداقت اور صالح شخص اللہ باری سبحانہ وتعالیٰ کا رسول ہے. اب اس کی خبر اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے کہ لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ.

ہیں اس سے انکار نہیں کہ افادۂ یقین عقل، حس، اور خبرِ متواتر سے نہیں ہوتا! بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو بات وحی سے ثابت ہے، وہ اِن تمام سے افادۂ یقین میں بڑھ کر ہے۔ اس تفصیل کے بعد یہ کہنا ہے کہ مصنف رحمہ اللہ نے جو چیزیں بیان کی ہیں نہ وہ مدرک بالعقل ہیں اور نہ مدرک بالحس اور نہ ہی مدرک بالخبر الصادق۔ بلکہ امام بخاریؒ کی پیش کردہ ہر بات وحی کی بات ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ وحی ہی دراصل اُوثق اور زیادہ تر قابلِ اعتماد ہے تو صغریٰ یہ ہوا کل ماذکر فی ہذا الکتاب فھو وحی سواء کان متلوا أو غیر متلو۔ اور کبریٰ یہ الوحی معصوم عن الخطاء، پہلا مقدمہ بدیہی ہے۔ مسلّم ہے، لیکن دوسرا مقدمہ نظری ہے اس کے اثبات کے لئے ہم روایات بیان کریں گے مگر دونوں مقدمات ثابت ہو جانے کے بعد تسلیم کرنا پڑیگا کہ کتاب میں آنے والے مضامین از اول تا آخر معصوم و محفوظ ہیں۔ مصنف نے سب سے پہلے اس باب کو اسی لئے قائم کیا تاکہ آنے والے ایمان وغیرہ سے متعلق مسائل کا معتمد علیہ ہونا ذہن نشین رہے۔ کسی شے کے حالات کے علم سے ہی اس کے متعلق۔ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ کسی کی اچھی حالت کا علم اس کے اچھے ہونے پر دلالت کرتا ہے اور کسی کے بُرے ہونیکا علم اس کے بُرے ہونے کی علامت ہے۔ جس طرح فخرِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بچپن ہی سے اس قدر پاکیزہ اور صالح رہی ہے کہ ہزاروں دشمن نگاہوں کے ہمہ وقت متلاشی رہنے کے باوجود، شمہ برابر بھی کوئی بات ایسی دریافت نہ ہو سکی جس کی آڑ لے کر آپؐ کو موردِ الزام قرار دیا جا سکے دِلی آرزوئیں پوری کی جا سکیں یہی وجہ ہے کہ انصاف پسند حضرات کفار کے انکار کو عناد و تمرد پر محمول کرتے ہیں۔ آپؐ ہی کے بارے میں کفار نے کہا تھا ما اجربنا علیک کذبا تو ظاہر ہے کہ جب مخلوق پر آپؐ میں جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں تھی تو خالق پر جھوٹ بولنے کی جرأت کیسی ہو سکتی تھی؟ ہرقل نے ابو سفیان سے جو اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے، اسی لئے دریافت کیا تھا ہل کنتم تتہمونہ بالکذب قبل ما قال؟ ابو سفیان نے جواب دیا کبھی نہیں۔ البتہ اب جو "حدیبیہ" میں عہد ہوا ہے اس میں

دیکھیے کیا رہتا ہے، ایفائے عہد کرتے ہیں یا عہد شکنی۔ ہرقل شاہ روم انہی باتوں سے تو متاثر ہوا تھا ــــ اب مصنف رحمۃ اللہ علیہ کیفیتِ مبدء وحی، اوسط وحی اور منتہاءِ وحی، سبکو بیان کرینگے اور بتائیں گے کہ وحی کہاں سے آئی، کون لایا، کس کے پاس آئی۔ چونکہ نتائج احوال اور ماحول سے ماخوذ ہوتے ہیں اس لئے امام بخاری کو ان کے بیان کرنے میں بے انتہا محنت کرنی پڑی ہے۔ مبدء سے چونکہ منتہا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس وجہ سے مصنف نے لفظِ بدء کو ذکر کیا ہے بدء عام ہے جو کہ شامل ہے بعد زمانی اور بُعد مکانی کو۔ ایسے ہی وحی بھی عام ہے جو کہ شامل ہے متلو اور غیر متلو کو لہذا روایت میں کسی ایک کی خصوصیت کی وجہ سے اشکال نہیں کیا جا سکتا۔ وحی کی مختلف قسمیں ہیں نبی کا خواب وحی ہے۔ الہام نبی وحی ہے اور فرشتہ کی وساطت سے جو چیز آئے وہ بھی وحی ہے فرشتہ خواہ بشری صورت میں ہو یا اپنی اصلی شکل میں۔

اصول یہاں ایک اصول یاد رکھنا چاہیئے، اور وہ یہ ہے کہ ترجمۃ الباب سے مراد کبھی معنی مطابقی ہوں گے اور کبھی التزامی۔ تو ترجمۃ الباب کے حقیقت میں دو معنی ہوں گے معنی اوّلیہ وہ جو ہر اہلِ لغت کے سمجھ میں آجائیں اور جو اہلِ معانی کے یہاں مطروح فی الاسواق ہیں، اور معنی ثانیہ سے مراد معنی التزامیہ ہیں۔ التزام سے عبارت منطقی لزوم نہیں ہے جس کے اندر انفکاک عقلاً ممتنع ہو۔ بلکہ مراد لزوم عُرفی ہے جو اہلِ معانی کے یہاں معتبر ہے اسی کے فہم میں کمال ہے جیسے "فلان کثیر الرماد" معنی لغوی ہیں فلاں بہت زیادہ راکھ والا ہے یہ ہر لغتِ عرب کا جاننے والا سمجھ جائے گا۔ لیکن یہ معنی مطروح فی الاسواق ہیں، مراد نہیں ہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ فلاں ضیاف کثیر الجود ہے۔ اس کے درمیان میں بہت سے وسائط ہیں۔ راکھ زیادہ لکڑی جلنے کی وجہ سے ہے۔ اور زیادہ لکڑی کا جلنا زیادہ پکنے کی وجہ سے ہے۔ اور زیادہ پکنا کثرتِ آکلین کی وجہ سے ہے۔ اور آکلین کی کثرت بوجہ سخاوت کے ہے جو لوگ ظاہری اور سطحی نظر رکھتے ہیں وہ ایسے

موقعہ پر تراجم بخاری کو دیکھتے ہی بے ساختہ بول اٹھینگے کہ حدیث کو ترجمۃ الباب سے کوئی مطابقت نہیں۔ لیکن جو اَرباب فکر و نظر ہیں وہ معنی ثانویہ مراد لے کر آسانی سے مطابقتِ ترجمۃ الباب تک پہنچ جائیں گے حافظ ابن حجر عسقلانی ایسی جگہ عموماً یہ الفاظ بولتے ہیں "غرضہ من ہذہ الترجمۃ کذا و کذا" جس میں غرض سے اشارہ معنی التزامیہ کی طرف ہوتا ہے۔ اگر یہ نکتہ پیش نظر رہا تو تمام روایات کا تطابق آسان اور سہل ہو جائیگا۔

وقول اللہ۔ یہاں قول مرفوع اور مجرور دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ مجرور ہونیکی صورت میں باب کا مضاف الیہ ہوگا۔ اور مرفوع ہونیکی صورت میں عبارت یوں ہوگی۔ فیہ قول اللہ الخ اس وقت اثباتِ ترجمہ کیلئے آیت ایک دلیل بن جائیگی۔ مصنف کی عادت ہے کہ وہ کبھی ترجمہ کو آیت سے ثابت کرتے ہیں، کبھی اس کے ثبوت کے لئے حدیث پیش کرتے ہیں اور کبھی صحابی یا تابعی کا قول! بہرکیف یہاں محض آیت کو پیش کرنا مقصد نہیں۔ بلکہ پورا رکوع مقصود ہے سوال یہ تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہ یک وقت پوری توراۃ مل گئی تھی اسی طرح آپ پر بھی پوری کتاب نازل کر دی جاتی، اللہ تعالیٰ نے پہلے رکوع میں یسئلک اہل الکتٰب ان تنزل علیہم کتابا من السماء فقد سالوا موسیٰ اکبر من ذالک فقالوا ارنا اللہ جہرۃ فاخذتہم الصعقۃ بظلمہم کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد دوسرے رکوع میں انّا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الیٰ ابراہیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وعیسیٰ وایوب ویونس وھٰرون وسلیمٰن واٰتینا داؤد زبوراً، فرمایا ہے جس کے اندر بتایا ہے کہ ہم نے جیسی نوح اور ان کے بعد دوسرے انبیا کی طرف وحی بھیجی ویسی ہی وحی آپ کی طرف بھی: "انا اوحینا" سے مبدءِ وحی کا علم ہوتا ہے اور وہ ہے جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ اسجگہ "انا" جو صفت متکلم مع الغیر کے لئے آتا ہے، استعمال کیا گیا۔ حالانکہ اَنا زیادہ مناسب تھا؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ صفتِ متکلم مع الغیر کے لئے بھی ہے اور اظہار عظمت کے لئے بھی۔ اللہ تعالیٰ کا مرتبہ چونکہ خالق دوجہاں کا مرتبہ ہے اس لئے مناسب تر یہی تھا کہ یہاں انّا

کا استعمال کیا جائے۔ اور قاعدہ ہے کہ فعل ہمیشہ اپنے فاعل کے تابع ہوتا ہے، فاعل اگر عظیم الشان
ہے تو اس کا فعل بھی عظیم الشان ہوگا لہذا امید، وحی جب اللہ تبارک وتعالیٰ بصفت التعظیم
ہوا تو معلوم ہوا کہ ما اوحی بھی مہتم بالشان ہے۔ اور اگر لفظ انا لایا جاتا ہے تو اوحیت کہنا پڑتا
جس سے صفت عظمت کا ظہور نہ ہوتا۔ الیک۔ اس سے منتہائے وحی کا پتہ چلتا ہے اور
وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، کما اوحینا الی نوح یہاں سے وحی کی کیفیت بیان
کی جارہی ہے کہ یہ وحی ایسی وحی نہیں ہے جیسی نحل اور ام موسیٰ کی طرف بھیجی گئی تھی، بلکہ یہ
وحی ایسی ہے جیسی حضرت نوح اور ان کے بعد آنے والے نبیین کی جانب ارسال کی گئی۔
یہ وحی اشارہ نہیں ہے، وحی نبوت ہے۔ اس لئے اس آیت سے ترجمۃ الباب کے ثبوت
کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ والنبیین۔ اس میں الف لام استغراق کا ہے یعنی جمیع النبیین من
بعدہٖ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انبیائے کرام اور خود حضرت نوح علیہ السلام
کے جمیع علوم کے جامع ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کا علم علیحدہ تھا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ
وغیرہ علیہم السلام کا علیحدہ لیکن نازش کونین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام حضرات
کے علوم کے جامع ہیں "علمت علوم النبیین" مذکورہ بالا آیت سے وحی کی عصمت وعظمت
پوری طرح واضح ہوگئی جس رکوع کی یہ آیت ہے اس رکوع میں وحی کی تمام تفصیلات
بیان کی گئی ہیں یوں دوسرے رکوعات میں بھی وحی پر بحث ہے لیکن مختصر انداز میں،
غیر اتم طریقہ پر۔ اسی لئے تو مصنف رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ واضح
رہے کہ "کما اوحینا" کے اندر التزامی طور پر فرض ایحار کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں
ایک اشکال ہے کہ "من بعدہٖ" کا لفظ کیوں بڑھایا گیا؟ در اصل شبہ یہ ہوتا ہے کہ آدم، شیث
اور ادریس وغیرہ علیہم السلام کی جیسی وحی آپ پر نہیں بھیجی گئی۔ جواب میں کہدو کہ واقعہ بھی یہی ہے
اس کو ایک تمثیل سے یوں سمجھو کہ جب کوئی شخص مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے زمین
خرید کر عمارت بنانی پڑتی ہے، مدرسین بلانے ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے لوازمات کا

اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ تو تدریس کی ابتداء سے پہلے جس طرح کچھ مقدمات و مبادی ہوتے ہیں اسی طرح یہاں بھی تکلیفاتِ انسانیہ اور تربیتِ انسانیہ سے پہلے کچھ مقدمات و مبادی کا ہونا، ضروری تھا، جبتک انسان نے تعمیری کاموں سے واقفیت حاصل نہیں کرلی اس وقت تک عظیم ترین مہم تعمیر تھی، اور تکلیفات میں صرف توحید و رسالت کی تعلیم یا زیادہ سے زیادہ مختصر سے احکام۔ پھر ان میں بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے تشدد نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ زمانہ گویا شخصِ اکبر یعنی عالم کی طفولیت و پرورش کا زمانہ تھا۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو مکان بنانے کے، حضرت شیث علیہ السلام کو زراعت کے، حضرت ادریس علیہ السلام کو خیاطی کے طریقے بتائے گئے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے یہ شخصِ اکبر جوان ہوگیا۔ اب اس کے اوپر تشدد کا آغاز ہونے لگا۔ دراصل عالم کے تین دور ہیں پہلا دور حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک ہے۔ یہ اس کے بچپن کا دور ہے دوسرا دور حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ہے۔ یہ جوانی کا دور ہے۔ اس زمانہ تک انسان کی ڈاڑھی سفید نہیں ہوتی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے حوارین کے ساتھ صحرائے عرب سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ کھڑے ہوکر آپ نے اونچی سی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان لوگوں سے فرمایا، تم جانتے ہو یہ کس کی قبر ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہم ناواقف ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا یہ نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی قبر ہے۔ حوارین نے ان سے ملنے کا اور ان کے زمانے کے، حالات دریافت کرنیکا اشتیاق ظاہر کیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قم باذن اللہ کہکر انھیں زندہ کردیا۔ سام قبر سے اٹھے تو دیکھا ان کی ڈاڑھی بالکل سفید ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متعجب ہوکر فرمایا، اُس زمانے میں تو ڈاڑھی سفید نہیں ہوا کرتی تھی! نوح علیہ السلام کے بیٹے نے جواب دیا کہ قیامت کے خوف سے میری ڈاڑھی سفید ہوگئی۔ تو بہرحال، حضرت نوح سے حضرت ابراہیم تک عالم کی جوانی کا دور ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

بعد سے عالم پر شیخوخت کا زمانہ طاری ہوتا ہے۔ انسان پر غلبۂ عقل کی یہی وجہ ہے حکمت و فلسفہ کا دور بھی یہیں سے شروع ہوا ہے، اسی وقت سے یونان وہندوستان اور، فارس وغیرہ میں حکماء پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ غرض یہ ہے کہ نوح علیہ السلام سے پہلے عموماً وحی میں تعمیراتِ عالم سے متعلق تعلیم ہوتی تھی، اور جب حضرت نوح تشریف لے آئے تب وحی تکلیفی وتشریعی آنی شروع ہوئی چنانچہ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر بھی وحی تکلیفی وتشریعی نازل ہوئی، قرآن اسی کو کہتا ہے انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ الخ۔

حدثنا الحمیدی تحدیث کے معنے لغت میں گفتگو کرنے کے آتے ہیں۔ لیکن محدثین کی عرف میں قراءۃ شیخ علی التلمیذ کو تحدیث کہتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام طور پر یہی عادت تھی کہ جب آیتیں نازل ہوتیں تو آپ لوگوں کو پڑھکر سناتے۔ محدثین متقدمین کے یہاں حدثنا اخبرنا۔ انبانا وغیرہ میں باہمی کوئی فرق نہیں تھا ان کے نزدیک یہ سارے الفاظ مترادف تھے چاہے قراءۃ شیخ علی التلمیذ ہو یا قراءۃ تلمیذ علی الشیخ یا شیخ نے کتاب تلمیذ کو دیدی ہو۔ لیکن متاخرین کے یہاں ان الفاظ میں فرق کیا جانے لگا وہ یہ کہ قراءۃ شیخ علی التلامذہ کو حدثنا، قراءۃ تلامذہ علی الشیخ کو اخبرنا۔ اور مناولۃ کی صورت میں انبانا کہینگے۔ اور اگر قراءۃ شیخ علی التلمیذ ہے تو حدثنی اور قراءۃ تلمیذ علی الشیخ ہے تو اخبرنی کہینگے۔ محدثین کی عادت ہے کہ وہ اختصار کے طور پر حدثنا کی جگہ صرف "ثنا" اور اخبرنا کی جگہ "انا" لکھتے ہیں۔ لیکن پڑھنے میں حدثنا واخبرنا ہی آئے گا۔ یہ نہیں کہ آپ ناوانا پڑھکر آگے بڑھ جائیں ــــ بہرحال مصنف رحمۃ اللہ علیہ روایتِ نیت کو پیش فرما رہے ہیں۔ یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر پڑھی، کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، منبر نبرۃ سے ماخوذ ہے جسکے معنی ارتفاع کے ہیں اسی وجہ سے خطیب عوام پر مرتفع ہوتا ہے۔ ابتداءً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے ہی کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے لیکن بعد میں جب لوگ بڑھنے لگے، مجمع زیادہ ہونے لگا تو منبر کی ضرورت پیش آئی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک انصاری عورت سے فرمایا کہ اپنے غلام نجار سے ایک منبر تیار کرادے، چنانچہ اس عورت نے منبر بنوا کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اللہ کے محبوب نبی نے پہلے دن جب اس پر خطبہ دیا تو ایک عظیم معجزہ ظہور پزیر ہوا۔ کھجور کا درخت جس سے سہارا لیکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے۔ رونے لگا آپ نے اسے سینے سے لگالیا اور فرمایا کہ اگر تو جنت کا درخت بننا چاہتا ہے تو میں تجھے یہاں دفن کردوں اور اگر یہیں رہنے کا خواہش مند ہے تو تیرے ہی پاس خطبہ دیا کروں، چنانچہ اس کی خواہش پر اسے دفن کردیا گیا۔

اس سے قبل اُمم ماضیہ میں بڑے بڑے معجزے ظاہر ہوئے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدھا بن گیا۔ فرعون نے شہرت یافتہ جادوگروں کو جمع کیا اور کہا کہ تم بھی اپنی اپنی چھڑیاں کے اژدھے بناؤ، چنانچہ انہوں نے اپنی چھڑیاں زمین پر ڈالدیں اور وہ جادو کے اثر سے موٹے موٹے سانپوں کی صورت میں تبدیل ہو کر رینگنے لگیں۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کا اژدہا ان سب کو نگل گیا۔ یہ سب کچھ ہے مگر موسیٰ علیہ السلام کا اژدھا، اژدہو نکی حرکت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی حرکت اژدہوں جیسی حرکت تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام نے طیر بنایا، مگر اس میں طیوری ہی روح پھونکی۔ نیز آپ سے احیائے موتیٰ کا ظہور ہوا۔ مگر وہی روح لوٹ کر آئی جس کو جسد کے ساتھ پہلے سے مناسبت رہ چکی تھی۔ لیکن پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ سب سے بڑھ کر ہے اس واسطے کہ درخت جامدِ محض تھا۔ اور پھر اس میں ایک مومنِ کامل اور محب رسول کی روح کا آجانا معجزہ کے کمال کی انتہا ہے۔

انما الاعمال بالنیات اس روایت کے تین اجزاء ہیں" انما الاعمال بالنیات۔ پہلا جزء ہے جو مجمل ہے۔ انما لامرء مانوی" دوسرا جزء ہے جسمیں کسی قدر تفسیر ہے اور تیسرا جملہ اس کی مکمل تفسیر کرتا ہے۔ انما لفظ حصر ہے۔ یعنی تنحصر الاعمال بالنیات۔ یہاں شبہ ہوتا ہے کہ نیت دراصل قصد قلب کو کہتے ہیں اور آدمی کے بہت سے اعمال بلا قصد و ارادہ بھی ہوتے ہیں لہذا حصر صحیح نہ ہونا چاہیے ہے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ یہاں کون خاص مقدر ہے یعنی وہ اعمال

جو مقصود ہیں صرف ان کے لئے نیت ضروری ہے جیسے نماز روزہ حج زکوٰۃ یہ اعمال
بلا نیت نہ معتبر ہوں گے نہ صحیح اور نہ مقبول! یہاں تک سب کا اتفاق ہے۔ البتہ وہ اعمال
جو براہ راست مقصود نہیں ہیں بلکہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں ان کے لئے بھی نیت ضروری
ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے شوافع فرماتے ہیں کہ یہاں الف لام جنس کا ہے،
جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اعمال کے واسطے نیت ضروری ہے وہ بغیر نیت صحیح نہیں ہونگے
اسی وجہ سے وضوء کے اندر بھی شوافع نیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ حنفیہ فرماتے ہیں
کہ جن چیزوں میں شرعی حیثیت سے قصد ثواب نہیں ہے بلکہ وہ محض آلات اور ذرائع
ہیں ان کے لئے نیت شرط نہیں۔ بارش میں بھیگ کر، کنویں یا تالاب وغیرہ میں گر کر اعضاءِ
وضوء اگر دھل گئے تو حنفیہ کے نزدیک یہ وضوء کے لئے کافی ہے، اسے از سرِ نو وضوء
کرنیکی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ شریعت کا مقصد خود وضوء نہیں ہے۔ بلکہ یہ آلہ اور مفتاح
للصلوٰۃ ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص ذنوب سے پاک صاف ہونے اور رضائت ولمعان حاصل
کرنیکی غرض سے وضوء کرے تو بلا شبہ اس کے لئے نیت ضروری ہوگی۔ کیونکہ اب اس کی
حیثیت وسیلہ کی نہیں رہی بلکہ امر مقصود کی ہوگئی اور ہر امر مقصود کے لئے نیت شرط ہے
اسیطرح "لا وضوء لمن لم یذکر اسم اللہ" میں کہا جائے گا کہ وضائت کے لئے ذکر اسم اللہ،
ضروری ہے۔ لیکن طہارت کے لئے نہیں۔

شوافع رحمہم اللہ، مذکورہ روایت میں لفظِ صحۃ مقدر مانتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اعمال کی صحت
کے لئے نیت ناگزیر ہے۔ حنفیہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ کاملۃ مقدر ہے۔ یعنی بغیر
نیت اعمال صحیح تو ہو جائیں گے مگر کمال حاصل نہیں ہوگا۔ واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ اگر درحقیقت
اعمال کی صحت کے لئے نیت ضروری ہوتی تو مہاجر ام قیس کی ہجرت درست نہ ہونی چاہئے
تھی اس لئے کہ اس شخص کی ہجرت خالصۃً للہ نہ تھی بلکہ ام قیس سے نکاح کرنے کی غرض
سے تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہئے تھا کہ اس شخص سے فرماتے کہ تمہاری ہجرت

صحیح نہیں ہوئی مکہ واپس جاؤ۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کے لئے ہجرت کی نیت سے مدینہ طیبہ آؤ۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی سے فرمایا تھا ارجع فانک لم تصل ــــــ حالانکہ ہجرت تو فرض بھی تھی۔

جس طرح ہر شے کے واسطے عالم مادی میں ایک شبیہ ہوتی ہے اسی طرح اس کے لئے روح بھی ہوتی ہے۔ لوگ حیوان میں تو روح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن دوسری چیزوں میں نہیں مانتے مگر آج سائنس قرآن حکیم کے اس فلسفہ کی نشاندھی کر رہی ہے قرآن نے ہر شے کو حساس بتایا ہے "وان من شئ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقہون تسبیحہم" سائنس پوری تحقیق کے ساتھ کہتی ہے کہ ہر ہر چیز میں روح موجود ہے۔ اصل میں ہر چیز کی شان جدا ہوتی ہے۔ مقناطیس کے اندر جو جزب و کشش کا مادہ ہے وہ حقیقت میں اس کے احساس کا نتیجہ ہے۔ مقناطیس ہی سے قطب نما بنائی گئی ہے جو بری و بحری سفر میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ چین کا ایک سائنس داں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ میں اپنی ہمراہ عمدہ گانے والے شخص کو باغ میں لے گیا اور پھولوں کے قریب پہنچکر میں نے اس سے گانے کے لئے کہا چنانچہ اس نے گانا شروع کیا اور میں خردبین لگا کر بیٹھ گیا۔ کہتا ہے کہ میں نے اس کی آواز کے ساتھ ساتھ پھولوں میں ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا ہوتے ہوئے دیکھی"۔ یہ کوئی بعید بات نہیں۔ چھوئی موئی کے پاس کھڑے ہو کر آپ ہاتھ کی ہلکی سی ہوا دیجئے دیکھیے فوراً ناراض ہوجائے گی۔ بعض درخت ایسے بھی سننے میں آئے ہیں کہ اگر آپ ان کے قریب سے گزریں تو وہ آپکو پوری طاقت سے چمٹ جائیں گے۔ اسی طرح ایک قسم کا پتھر ہوتا ہے جو سرکے سے دور بھاگتا ہے۔ یہ سارے احساس کے قرائن ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ احساس بغیر روح کے ہو نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے ماننا پڑے گا کہ ہر شے ذی روح ہے۔ اگرچہ کسی کی روحانیت کمزور ہے اور کسی کی توی غرضیکہ ہر چیز کی ایک شبیہ ہے اور ایک روح۔ شبیہ تو ظاہری جسد ہے اور خلاصہ روح۔ فکما ان الانسان بل کل حیوان

بل کل شئ یقدر بروحہ وکذالک کل عمل یقدر بروحہ۔ ایک شخص شبیہ انسانی رکھتا ہے لیکن روح میں خباثت ہے تو کہدیا جائے گا، اولٰئک کالانعام بل ہم اضل، اور ایک شبیہ اصحاب کہف کے کلب کی تھی، مگر چونکہ روح میں نفاست تھی اس لئے اسکا مقام بلند تر کر دیا گیا لقمان کی شبیہ مادی اعتبار سے نہایت خراب تھی، لیکن روح میں عظمت تھی چنانچہ کہدیا گیا وا تینا لقمان الحکمۃ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی تھے، سیاہ فام تھے، مگر روح کی نفاست نے اُنھیں اسقدر اونچا اُٹھایا کہ محبوب داور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں اپنے آگے آگے ان کے چلنے کی آہٹ سنتے ہیں۔ عطا ابن ابی رباح بڑے بدشکل تھے۔ کریہ المنظر تھے، لیکن ابو حنیفہؒ جیسے بلند پایہ امام کہتے ہیں کہ

ما رئیت احداً افضل من عطا ابن ابی رباح۔

اس کے برخلاف ایک ابولہب تھا اس کو ابولہب کہا ہی اس لئے جاتا تھا کہ وہ نہایت حسین وجمیل تھا لیکن چونکہ روح میں خباثت تھی اس لئے تبت یدا ابی لہب وتبّ فرمایا گیا۔ لہٰذا اب یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انما الناس بالارواح۔

اسی طرح عمل کے لئے بھی شبیہ اور روح ہوتی ہے۔ اعضا کی حرکت جو صدور اعمال کے لئے ہوتی ہے یہ شبیہ ہے اور نیت اس کی روح۔ انما الاعمال بالنیات ایسے ہی ہے۔ جیسے انما الناس بالارواح کہا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ روح اگر حقیقت میں اعلیٰ درجہ کی ہے تو عمل بھی اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے فرار من النار اور دخول جنت کی نیت سے تو نماز صحیح ہوگی۔ اور ایک دوسرا شخص نماز پڑھتا ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ لیکن ریائ تو یہ صلوٰۃ ساقط الاعتبار ہوگی۔ جن لوگوں کو اونچا مقام حاصل ہے وہ پہلی صورت میں بھی شرک خفی کے قائل ہیں کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صفت قرآن میں یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا، بیان کی گئی ہے ؎

فراق و وصل چہ خواہی رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از وغیر از یں تمنائے

ایک مرتبہ وصول الی اللہ کا درمیانی مرتبہ ہے۔ اس لئے کہ تیسرے درجہ میں فراق و وصل

سے استغنا رہے محض رضا کی طلب ہے۔ یہ درجہ ان سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کے درجہ تک بڑے سے بڑا ولی بھی باوجود اپنی تمام خصوصیات کے نہیں پہنچ سکا۔ اور نہ قیامت تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی باعث صحابہ کے ناموں کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے صوفی لا محبوب لی الا اللہ کہتا ہے اور وصول چاہتا ہے لیکن بڑے درجہ کا صوفی وصل سے بھی مستغنی ہے۔ اس کے قلب میں تو صرف رضا کی طلب جاگزیں رہتی ہے چاہے فراق ہی میں اس کی رضا کیوں نہ ہو۔ دراصل یہ نیت کے مختلف درجات ہیں۔ اگر شیخ اعلیٰ پیمانہ پر خانہ کعبہ میں نماز پڑھے، مگر ریائً تو یہ شرک اصغر ہے اور اسی نیت میں ذرا سی ترقی ہو یعنی بجائے ریا کے دخول جنت اور فرار عن النار کے لئے پڑھے تو اس کی نماز شرعاً درست بھی ہوگی اور عند اللہ مقبول بھی۔ لیکن یہ نماز کا ادنیٰ درجہ ہے۔ جس کو صوفی شرک سے تعبیر کرتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس میں غیر خدا کی طلب پائی جاتی ہے۔ شرکِ صوفی اور شرکِ شرعی میں فرق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی کفر کے مختلف درجات ہیں۔ فرماتے ہیں، "کفر دون کفر" ہو سکتا ہے کہ بعض کے نزدیک ایک چیز کفر ہو اور دوسروں کے یہاں وہی ایمان!

انما الاعمال بالنیات کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعمال شبیہ کے اندر ایک سے ہیں۔ فرق اگر رونما ہوتا ہے تو صرف روح اور نیت کی وجہ سے، ایک ہی عمل کے باعث کوئی مشرک کہلائے گا۔ کوئی مومن۔ پھر کوئی مومنِ متوسط اور کوئی مومن کامل۔ حضرت داؤد کبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

علیٰ قدر ارتقاء ہمتک فی نیتک یکون ارتقاء درجتک عند عالم سریرتک۔ تمہارے درجات کی ترقی تمہاری نیت کی ترقی کے تابع ہے کوئی طالب دنیا ہے۔ کوئی طالب عقبیٰ۔ کوئی طالب وصول۔ کوئی طالب رضا۔ اور کوئی ان سب سے بے نیاز و بالاتر ہو کر محض استحقاقِ باری کی وجہ سے عبادت کرتا ہے۔ یہ اعمال کے مختلف مراتب ہیں۔ اب انما الاعمال بالنیات کا مطلب

انما ارتقار الاعمال بروجہا ای بنیتہا ہوگا۔ اس صورت میں بالنیات کی ب سببیہ ماننی پڑے گی۔ تیسرے جملہ سے تمثیل کے اندر پہلے دونوں جملوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ ہجرت عمل خیر ہے۔ جو شبیہ ہجرتِ ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما کی ہے وہی ہجرتِ مہاجر ام قیس کی۔ لیکن روح کی تبدیلی کی وجہ سے مراتب اعمال میں تبدیلی آگئی۔ بعض لوگوں نے بالنیات کی ب کو الصاق کے لئے لیا ہے۔ اس روایت کے اندر اختصار ہے ورنہ بعض روایات میں مَن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فہجرتہ الیٰ اللہ ورسولہ، بھی آیا ہے۔ شاید یہ تصرف راوی کا نتیجہ ہوا۔

اشکال ہوتا ہے کہ مسند و مسند الیہ اور شرط و جزا میں تغایر ضروری ہے، اور یہاں اتحاد ہے جیسا کہ من کانت الخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ شرط و جزا میں مفارقت کبھی لفظی ہوتی ہے اور کبھی معنوی۔ شعری شعری۔ انا انا۔ انا ابوالنجم وغیرہ کے اندر بھی اتحاد ہے مگر معنی میں تغایر ہے۔ مراد یہ ہے شعری شعر الکامل۔ انا انا الکامل۔ انا مشہور بابی النجم۔ اسیطرح یہاں بھی مراد ہے من کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ نیۃً وقصداً، فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ثواباً۔ تو شرط میں حیثیتِ نیت و قصد مراد ہے اور جزا میں حیثیتِ ثواب ملحوظ۔

فمن کانت ہجرتہ الیٰ دنیا دینا پر اکثر لوگ تنوین نہیں دیتے، مگر بعض لوگ اسے منوّن پڑھتے ہیں۔ بہرحال عالمِ مشاہد دنیا کہلاتا ہے اور اس کے مقابلے میں اُخریٰ بولا جاتا ہے۔ دنیا کو کچھ لوگوں نے دنو (بمعنی قرب) سے ماخوذ مانا ہے اور بعض حضرات دنائت سے ماخوذ مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز میں دنائت ہے۔ وجوہ مختلف ہیں۔ قرآن حکیم نے دنیا کی کچھ چیزوں کو مزین کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اور تزئین صاحب زینت کی کی نہیں جاتی اور نہ ہوتی ہے۔ بلکہ تزئین دنی اور ردی شے کی ہوتی ہے۔ فرمایا گیا زین للناس حب الشہوٰت من النساء والبنین الخ کہیں آتا ہے انا جعلنا ما علی الارض زینۃً لہا بخلاف آخرت کی اشیاء کے۔ اوالیٰ امرأۃ ینکحہا یہ

ذکر خاص بعد العام ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک صحابی ام قیس نامی عورت سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ ام قیس نے ان کی درخواست پر نکاح منظور کر لیا، لیکن ہجرت کی شرط پر چنانچہ وہ صحابی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے۔ معجم کبیر میں طبرانی نے اس واقعہ کو بسندِ قوی نقل کیا ہے۔

اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ روایت کو ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے؟ اس میں نہ ابتداء کا ذکر ہے اور نہ وحی کا۔ بعض لوگوں نے جواب دیا کہ مصنفؒ اس روایت کو محض طوتیۃً و تمہیداً لائے ہیں گویا قارئینِ بخاری کو اخلاصِ نیت پر متنبہ کرنا مقصود ہے۔ اس روایت کا تعلق نفسِ نیت سے نہیں اس لئے کہ ہجرت جیسی چیز جو کہ فرض ہے جب اس کے واسطے نیتِ خالصہ کی ضرورت ہے تو روایات کا پڑھنا پڑھانا لکھوانا چھپوانا ان امور میں بھی نیتِ خالصہ ناگزیر ہوگی۔

اس جواب پر ایک اعتراض پڑتا ہے وہ یہ کہ اگر حقیقت میں تمہید ہی مقصود تھی تو باب کے قائم کرنے سے پیشتر اسے کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟ بایں وجہ یہ جواب اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ بعض کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچتے ہی ابتداءً یہ کلمات بیان فرمائے ہیں اس وجہ سے روایت کو بدأ الوحی سے مناسبت ہے۔ مگر اس پر شبہ یہ ہوگا کہ روایت کا اثبات پہلے ضروری تھا۔ دوسرے یہ کہ یہاں نفسِ ابتداء تو ہے ابتدائے وحی تو نہیں! وحی اور اسلام کی ابتداء تو اس سے تیرہ سال پہلے ہو چکی ہے۔ لہٰذا دونوں میں کیا مناسبت ہوئی؟

تاویل کی جاتی ہے کہ اسلام کی ایک ابتدائے حقیقی ہے اور ایک ابتدائے کمالی، اور یہ مدینہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس جواب میں بلاوجہ کا تکلف ہے جو پوشیدہ نہیں صحیح تر بات یہ ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقصد عظمتِ وحی، صداقتِ وحی اور عصمتِ وحی کو بیان کرنا ہے اور روایت کے اندر نیت کو ارتقائے مراتب اور ارتقائے اعمال کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔ نیت گویا علت ہے اور ارتقا معلول۔ اور استدلال انّی میں معلول سے علت کا

ادراک ہوتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں ارتقاء پایا جاتا ہے اور وہ یہی ہے کہ آپ کو وحی و نبوت اور رسالت جیسی مہتم بالشان دولت سے نوازا گیا، اور پھر انتہائی کمال پر پہنچا دیا گیا۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شئی علیما ان درجات کے ارتقا سے معلوم ہوا کہ اعمال کے اندر آپ کا ارادہ، نیت اور قصد مستحسن تھا۔ اور اصل میں یہی نیت علت وحی نبی اور علت مبدأ ہوتی ہے، لہٰذا مبدأ وحی کا پتہ چلا اس سے معلوم ہوا کہ روایت کو ترجمۃ الباب سے مطابقت ہے یہ روایت امہات مسائل اسلامیہ میں شمار کی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسے نصف علم کہا ہے۔ ابو داؤد کا قول ہے کہ چار حدیثیں اسلام کے اصول میں سے ہیں (۱) انما الاعمال بالنیات (۲) من حسن اسلام المرء ترکہ مالایعنیہ (۳) لایؤمن احدکم حتیٰ یحب لاخیہ مایحب لنفسہ (۴) الحلال بین والحرام بین وبینہما المشتبہات فمن اتقی المشتبہات فہو المتقی، حدثنا عبداللہ بن یوسف ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حارث ابن ہشام نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مجھ پر وحی کبھی گھنٹی کی آواز کے مانند آتی ہے، جو زیادہ شدید ہوتی ہے۔ پس اس کے دور ہوتے ہی وہ فرشتہ جو مجھ سے کہتا ہے میں اسے یاد کر لیتا ہوں۔ اور کبھی وہ فرشتہ آدمی کی شکل میں آکر میرے ساتھ کلام کرتا ہے، پس جو کچھ وہ کہتا ہی میں یاد کر لیتا ہوں، حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں نے سخت جاڑے کے دنوں میں آپ پر وحی اترتے ہوئے دیکھی ہے۔ اور جب وہ دور ہو جاتی تھی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہا کرتا تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین کہا گیا ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام مومنین کے ان کے اپنے نفوس سے زیادہ قریب تر ہیں النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم۔ اولیٰ بمعنی اقرب ہے۔ یا یہ ولایت سے ماخوذ ہے یعنی نبی کو اپنے نفس سے زیادہ

مومنین پر حق حاصل ہے۔ معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومنین سے بالکل ایسے قریب ہیں، جیسے علت اپنے معلول سے اس لئے کہ ایمان مومنین کے پاس آپؐ ہی کے واسطہ سے تو آیا ہے۔ تو آپ اس حیثیت سے واسطہ بالعروض ہوئے انما انا قاسم واللہ یعطی،، اور واسطہ بھی یہی درجہ رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مومنین کے روحانی باپ ہیں لہذا آپؐ کی ازواجِ مطہرات اُمہاتِ مومنین کہلائیں گی وازواجہ اُمہاتہم،، لیکن یاد رہے کہ صرف ادب واحترام کی حیثیت سے ہر اعتبار سے نہیں کبھی آپ کہنے لگیں کہ جب وہ ہماری مائیں ثابت ہوئیں تو پردہ وغیرہ کا بھی کوئی سوال نہ ہونا چاہیئے. کیف یاتیک الوحی بعض حضرات نے اس کا مطلب کیف یاتیک حامل الوحی، اور بعض نے صفتِ نفس وحی لیا ہے. ممکن ہے حارث ابن ہشام نے نفس وحی کا سوال کیا ہو، بہرحال اسنادِ اتیان الی الوحی مجازاً ہوگی لان الاتیان حقیقۃ من وصف حامل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نزولِ وحی کے دو طریقے بیان فرمائے ہیں. لیکن ان دو ہی طریقوں میں حصر مقصود نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی ہیں، الہاماتِ انبیاء، وحی ہیں آپ فرماتے ہیں، نفث فی قلبی الملک کذا وکذا. فرشتہ کبھی اپنی اصلی صورت میں وحی لیکر آتا ہے فتدلیٰ فکان قاب قوسین اوادنیٰ۔

یہاں دو طریقوں کی تخصیص محض اغلبیت کی وجہ سے ہوئی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی بلا واسطہ بھی کلام کرتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور لیلۃ المعراج میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے. اس لئے حصر ہرگز مقصود نہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جس وقت یہ سوال کیا گیا اس وقت صرف انہی دو طریقوں سے وحی آتی تھی. لیکن یہ جواب بننا مشکل ہے وجہ یہ ہے کہ ابن ہشام فتح مکہ میں اسلام لائے ہیں اور اس سے پہلے ملک کے صورتِ اصلیہ میں آنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے بلا واسطہ کلام کرنیکا ثبوت ملتا ہے. صلصلۃ الجرس جرس اس گھنٹی کو کہتے ہیں جو جانوروں کے گلے میں ڈالی جاتی ہے. صلصل لغت میں اس جھنجھناہٹ کو کہتے ہیں جو لوہے کو لوہے پر مارنے سے

پیدا ہوتی ہے. لیکن عرف عام میں ہر اس متدارک متصل آواز کو کہا جاتا ہے جسمیں الفاظ و حروف کا باہم تمیز نہ ہو سکے. اشدہ شدت کے معنی کبھی قوت کے ہوتے ہیں اور کبھی مشقت و گرانی کے جیسے فقیہٌ واحدٌ اشدّ علی الشیطان من الف عابد،، ای اشق علی الشیطان، اسیطرح یہاں بھی اشد کے معنی اشق ہی کے ہیں، یعنی اس صورت میں مشقت زیادہ ہوتی ہے.

نوعِ اول کی وحی میں مشقت کیوں؟ یہ وحی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت زیادہ گراں گذرتی تھی کیونکہ اس صورت میں محض صلصلۃ الجرس یعنی صوتِ متدارکہ ہوتی تھی. اور اس میں ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے متمیز کرنا بڑا مشکل کام تھا. اس کا معمولی سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مثلاً جو آدمی تیز بولنے کے عادی ہوتے ہیں. ان کی باتیں سمجھنے میں ہمیں کس قدر دقت پیش آتی ہے حالانکہ یہاں صوتِ متدارکہ نہیں ہوتی. بہرکیف صلصلۃ الجرس میں مختلف اقوال ہیں. بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ملک کی گفتگو کی آواز ہے اور چونکہ ملک کی آواز ہماری آواز کی طرح نہیں ہوتی، اس وجہ سے آپؐ کو اس کے سمجھنے میں سخت دشواری پیش آتی تھی. بعض کہتے ہیں کہ ملک کے بولنے کی آواز نہیں، بلکہ اس کے آنے کی آواز ہے، جیسے کوئی جانور جب اوپر سے تیزی کے ساتھ نیچے کی جانب آتا ہے تو صورتِ متدارکہ پیدا ہوتی ہے. بعض کا خیال ہے کہ مخاطب و متکلم کے درمیان ارتباط ضروری ہوتا ہے خواہ مکانی ہو، خواہ نوعی. حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور وحی لانے والا فرشتہ انواع مختلف ہیں، یہاں دو صورتوں میں سے، بہرحال ایک صورت ناگزیر ہے وہ یہ کہ یا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت کی طرف ترقی کریں یا ملک بشریت کی جانب تنزل. اس کے بغیر نہ القاء ممکن ہے اور نہ تلقی. پہلی صورت میں آپؐ کو بشریت سے ملکوتیت کی طرف ترقی کرنی پڑتی تھی. جو سراسر خلافِ طبع تھی. اس میں جسقدر بھی مشقت و گرانی محسوس ہوتی وہ ظاہر ہے. چنانچہ اتصالِ عالمِ علوی کے وقت یہ آواز متدارکہ پیدا ہوتی تھی. بعض کا خیال ہے کہ وحی کے آنے سے ذرا پہلے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت متخیلہ کو ہر طرف سے ہٹا کر عالم مجرد کی طرف متوجہ کرنیکی یہ ایک صورت تھی

جیسے ٹیلی فون پر گفتگو سے پہلے گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ تاکہ مخاطب کی پوری توجہ سماعت کی طرف مبذول ہو جائے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ آواز جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کے کلام نفسی کی آواز ہے۔ باری تعالیٰ کا کلام حروف و اصوات کی قید سے منزہ ہوتا ہے۔ جسطرح اس کی ذات لیس کمثلہ شئی ہے۔ اسی طرح اس کی صفات بھی لیس کمثلہا شئی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جو کلام باری سنا ہے اس کے بارے میں بھی اشاعرہ کہتے ہیں کہ وہ کلام نفسی تھا۔ ماتریدیہ کا خیال ہے کہ وہ کلامِ لفظی تھا۔ بہرحال اس پر اتفاق ہے کہ کلام نفسی ممکن السمع ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حقیقت میں "صلصلة الجرس" اس کیفیت کا نام ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حواس میں پیدا ہو جایا کرتی تھی انسان کی قوت سامعہ کا قاعدہ ہے کہ جب اس کو اور طرف سے ہٹا کر کسی خاص طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو ایک کیفیت صوتیہ متدارکہ پیدا ہوتی ہے۔ تو یہاں بھی گویا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت سامعہ کو دوسری چیزوں سے روکا جاتا تھا جس کے نتیجہ میں یہ آواز پیدا ہوتی تھی حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اسی توجیہ کو پسند فرمایا ہے۔

واحیانا یتمثل لی الملک ملک جوہر مجرد مخلوق من النور لیقدر علی التمثل بکل صورۃ کو کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ مجرد سے عبارت مجرد عن النار ہے۔ نار کے اندر احراق ہوتا ہے، گرمی ہوتی ہے، اور نور کے اندر بشاشت وحسن اور انشراح ہوتا ہے۔ جیسے سورج کے اندر احراق ہے اور چاند کے اندر نور اور ٹھنڈک فرشتے نور سے بنائے گئے ہیں اس لئے ان میں خیر ہی خیر ہے اور جنات و شیاطین میں نار کا مادہ غالب ہے۔ اس وجہ سے ان میں شر کا غلبہ ہے۔ ملک الوکہ سے ماخوذ ہے جسکے معنی اطاعت کے آتے ہیں۔ طاعت وعبادت ملائکہ کی فطرت میں داخل ہے، بخلاف انسان کے کہ عبادت اس کی طبعی چیز نہیں ہے یہ طبیعت پر زور دیکر عبادت کرتا ہے اسی واسطے مستحق اجر ہے جیسے ہمارا سانس لینا فطری امر ہے اس میں ہمارے لئے کوئی دشواری نہیں، بلکہ سانس نہ لینے میں موت ہے ایسے ہی ملائکہ کے لئے عبادت کا معاملہ ہے، فیفصم عنہ نزولِ وحی کے وقت

کرب و بے چینی اور اضطراب کا شدید عالم رہتا تھا، حتیٰ کے اس کے منقطع ہوجانے کے بعد تک آپ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے۔

روایت کے اندر طرقِ وحی کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور ترجمۃ الباب میں وحی کا تذکرہ ہے، لہٰذا دونوں میں کیا مناسبت ہوئی؟ - جواب یہ ہے کہ معنی مطابقی ہی کے اعتبار سے تو مناسبت مقصود نہیں، بلکہ اگر معنی التزامی سے بھی ثابت ہوجائے تو کافی ہے۔ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ، مصنف کا مقصد ترجمۃ الباب سے عظمتِ وحی کو بیان کرنا ہے۔ روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کے وقت آپ کو انتہائی مشقت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کہیں سے نقل نہیں کرتے تھے۔ اور نہ مقالہ نگار تھے۔ کیونکہ ان صورتوں میں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک تابناک حقیقت اور بالکل اصلیت ہے کہ آپ کو مادیت سے روحانیت کی طرف منتقل ہونا پڑتا تھا اور کبھی ملک کو ملکوتیت سے مادیت کی طرف آنا۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ واسطہ بین المبدء والمنتہیٰ ملک ہے ان وجوہ کی بنا پر عظمت وحی ثابت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ترجمۃ الباب کے مناسب ہے۔ پھر اس بات سے کہ آپ پر وحی آنے کی عادت بایں طور تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سے یہی طریقہ رہا ہوگا اس لئے ابتداء وحی کا علم بھی ہوگیا اور ترجمۃ الباب کے معنی مطابقی بھی ثابت ہونے میں کوئی الجھن باقی نہ رہی

حدثنا یحییٰ بن بکیر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے پہلے اچھے اچھے خواب آنے شروع ہوئے پس آپ جو بھی خواب دیکھتے تھے وہ ایسے ہوجاتے تھے جیسے صبح صادق کی روشنی (یعنی اس کی تعبیر جلد سامنے آجاتی تھی) پھر آپ کے قلب مبارک میں خلوت کی محبت پیدا کی گئی۔ اور آپ غارِ حراء میں گوشہ نشین رہنے لگے۔ کئی کئی رات وہاں رہتے، اور عبادت کرتے اور گھر کی طرف مراجعت نہ فرماتے اس عرصہ کے لئے خوراک ساتھ رکھتے اور پھر یعنی خوراک ختم ہوجانے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور حسب ضرورت خوراک

لیجاتے حتیٰ کہ غار حرا میں آپؐ پر وحی نازل ہوئی۔ پس جب آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اُس نے آپؐ سے کہا کہ پڑھ! آپؐ فرماتے ہیں، میں نے کہا کہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ آپؐ نے فرمایا۔ (یہ سنکر) اس نے مجھے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ میری طاقت ختم ہو گئی۔ پھر اس نے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھ! میں نے کہا کہ میں تو قاری نہیں ہوں۔ پھر اُس نے مجھے پکڑ کر اتنی ہی طاقت سے دبایا حتیٰ کہ تین مرتبہ میری ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔ اور پھر کہا اقرا باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرا و ربک الاکرم پھر یہ آیتیں پڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکان کی طرف لوٹے درانحالیکہ آپؐ کا قلب (خوف سے) کانپ رہا تھا۔ پس آپؐ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس تشریف لائے اور فرمایا زَملونی زَملونی مجھے اڑھاؤ مجھے اڑھاؤ پس حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو کپڑا اڑھا دیا یہانتک کہ وہ خوف جاتا رہا۔ پھر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو تمام واقعہ سنایا، اور فرمایا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا ہرگز نہیں قسم ہے خدا کی اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ اس لئے کہ آپؐ لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں محتاجوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں لوگوں کو ایسی چیز دیتے ہیں جسے وہ خود حاصل نہیں کر سکتے۔ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ مصیبت کے وقت میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپؐ کو ورقہ ابن نوفل ابن اسد ابن عبد العزی (جو خدیجہ کا چچا زاد بھائی تھا) کے پاس لے گئیں۔ یہ شخص زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا (بت پرستی چھوڑ دی تھی) اور عبرانی زبان میں کتابوں کا ترجمہ کیا کرتا تھا۔ اس نے انجیل کا ترجمہ بھی عبرانی زبان میں کیا تھا۔ یہ شخص بوڑھا تھا، اس کی بصارت ختم ہو گئی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس سے کہا یا ابن عمی! اپنے بھائی کے بیٹے سے ان کی حالت سنئے۔ ورقہ نے آپؐ سے کہا یا ابن اخیک تو نے کیا دیکھا ہے؟ آپؐ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرما دیا۔ پس ورقہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یہ ناموس ہے جو حضرت

موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا تھا۔ کاش میں اس زمانہ میں جوان ہوتا! کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب کہ تمہاری قوم تمہیں نکالے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (متعجب ہوکر) فرمایا کیا مجھے نکالدی گی میری قوم؟ ورقہ نے کہا کہ ہاں تمہارے مثل جو بھی کوئی آدمی لیکر آیا ہے لوگوں نے اس کے ساتھ دشمنی روا رکھی (یعنی انبیائے کرام کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا ہے) اگر تمہارے زمانہ تک زندہ رہا تو تمہاری خوب مدد کروں گا۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد ورقہ کا انتقال ہوگیا، اور وحی بھی منقطع ہوگئی۔ ابن شہاب نے کہا کہ خبر دی مجھکو ابو سلمہ ابن عبد الرحمٰن نے کہ جابر ابن عبد اللہ انصاری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ فترتِ وحی کا تذکرہ فرمارہے تھے۔ اسی بیان میں ارشاد فرمایا کہ میں چلا جارہا تھا دفعتہً میں نے آسمان پر ایک آواز سنی، آنکھ اٹھاکر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہوا پس میں وہاں سے لوٹ آیا اور میں نے کہا زملونی زملونی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی یاایھا المدثر قم فانذر وربك فكبر وثيابك فطهر والرجز فاهجر۔ اس کے بعد وحی پے در پے آنے لگی۔ یحیٰی ابن بکیر کا عبد اللہ ابن یوسف اور ابو صالح تابع ہوا ہے یعنی تینوں لیث کے تلامیذ ہیں اور عقیل کا تابع ہلال ابن رداد زہری سے ہوا ہے یعنی دونوں زہری کے شاگرد ہیں۔ یونس اور معمر نے فؤادہ کی جگہ بوادرہ کا لفظ ذکر کیا ہے۔

یہ روایت ترجمۃ الباب کے معنی مطابقی کے بالکل موافق ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اگرچہ اس وقت موجود نہیں لیکن اغلب یہی ہے کہ انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنکر روایت بیان کی ہے صالحہ بمعنی صادقہ یعنی جیسا آپؐ نے خواب میں دیکھا ایک یا دو دن بعد ویسا ہی وقوع پذیر ہوا۔ لیکن یہ اسی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے

ان تمام صورتوں کو جو خواب میں آئیں وہ واقع کے مطابق ہوں (اگر امور کونیہ میں سے ہیں) یا ذات باری صفات باری وغیرہ سے ہوں۔ مگر "الا جاءت مثل فلق الصبح" نے تخصیص کردی اور بتادیا کہ امور مستقبلہ یعنی عالم مثال سے متعلق امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم شہادت میں ظاہر ہونے سے قبل دکھادئے جایا کرتے تھے۔ لوگوں نے اسی کی واقعہ صادقہ کے ساتھ تفسیر کردی۔ اور بعض دوسرے لوگوں نے اکثر سے تفسیر کی ہے، جس کے اندر واقعہ یا غیر واقعہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ عالم غیب اور عالم شہادت کے مابین ایک تیسرا عالم ہے اسی کو عالم مثال کہا جاتا ہے دراصل دنیا کے اندر جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ انھیں اولاً عالم غیب میں رکھا جاتا ہے اور پھر جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کے ایماء سے عالم مثال میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد درجہ آتا ہے عالم شہادت یعنی دنیا کا۔ عالم مثال میں اشیاء کی صورتیں عالم شہادت سے مختلف ہوتی ہیں مثلاً عالم مثال میں علم کی صورت دودھ کی ہے اور دشمن کی صورت سانپ کی اور دنیا کی صورت پاخانہ کی۔ جو لوگ معبتر ہوتے ہیں انھیں عالم مثال سے ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا عبارت بعض رؤیاء کے متعلق ہے یا مطلب یہ ہے کہ انہی واقع ہونے والی اشیاء کو اس وقت صالح شمار کیا جاتا تھا۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ جب کسی کمال کو حاصل کرنا ہو تو موانع سے محفوظ رہنا اور اسباب کو اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح امور آخرت اور غیبیہ کو حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ مادیات سے انقطاع کیا جائے اور وسائل روحانیہ کو اختیار کیا جائے۔ نوم میں بھی یہ انقطاع ہوجاتا ہے اسلئے خواب میں امور غیبیہ دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ جزئیات ہوتی ہیں۔ فلق صبح کی روشنی کو کہتے ہیں اور اصل فلق کے معنی چیرنے کے ہیں صبح کی روشنی بھی چونکہ رات کی تاریک چادر کو چیر کر نمودار ہوتی ہے اس مناسبت سے نور سحر کو "فلق" کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ صبح کی روشنی میں خنکی اور راحت ہوتی ہے، بخلاف دھوپ کے کہ اس میں تمازت اور جلن ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی وجہ سے "فلق الصبح" کا لفظ استعمال کیا ہے، ضیاء الشمس نہیں فرمایا۔

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ روایات میں "رویائے صالحہ" کو من الوحی کہا گیا ہے. حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب نبوت سے کافی عرصہ قبل دیکھے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ وحی نبوت کے بعد آتی ہے، جواب یہ ہے کہ "رویائے صالحہ" کا وحی میں سے ہونا نبوت پر موقوف نہیں ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الرویا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین النبوۃ، "رویائے صالحہ" مومن کو بھی ہوتے ہیں جیسا کہ روایات سے ثابت ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ "رویائے صالحہ" نبوت پر موقوف نہیں، اسے نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک جز کے حاصل ہو جانے سے نبوت تو حاصل نہیں ہو جائیگی! آپ کی نبوت تیئس سال رہی اور "رویائے صالحہ" چھ مہینہ اسی باعث اسے نبوت کا چھیالیسواں جز کہا گیا ہے. لیکن صحیح تر یہ ہے کہ اسکا حقیقی علم محض اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہے. بہر کیف جب "رویائے صالحہ" کی وساطت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتصال اور ایک ربط عالم غیب سے پیدا ہو گیا تو اب یقظ کی صورت میں انقطاع عن العالم اور توجہ الی اللہ کرائی گئی اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ نے آپؐ کے قلب میں لوگوں سے اجتناب اور تخلیہ کی انتہائی محبت و تڑپ جاگزیں فرمادی آپؐ ہر وقت آبادی سے دور رہنا پسند کرنے لگے چنانچہ آپؐ نے اپنا مسکن غار حراء کو بنالیا. حراء مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے، اس کے اندر ایک غار تھا آپؐ اس میں متمکن ہوئے (لفظ حراء منصرف غیر منصرف عدد مقصور ممدود مونث غیر مونث ہر طرح پڑھا جاتا ہے۔ قباء بھی اسیکے حکم میں ہے) اگر آپؐ مکہ میں تخلیہ نہ کرتے تو انقطاع اتنا کامل نہ ہوتا اور نہ اس قدر فائدہ مند. اس لئے کہ جہاں انقطاع اور توجہ الی اللہ مقصود ہے وہاں یہ بھی مقصود ہے کہ لوگ اس علم کو جو منظر عام پر آنے والا ہے، مکتسب نہ گردانیں. مکہ میں اگر تخلیہ نہ کیا جاتا تو اکتساب کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے تخلیہ کے واسطے ایسی جگہ منتخب کی گئی جہاں اس طرح کا کوئی شبہ باقی نہ رہے. فیتحنث یہ سلب ماخذ کے لئے ہے حنث گناہ کو کہتے ہیں. یہاں ترکِ ذنب وہو التعبد مراد ہے. یہ تفسیر زہری نے کی ہے، حدیث کی عبارت نہیں ہے. اللیالی ذوات العدد لفظ عدد

کو بعض لوگ قلت کے لئے کہتے ہیں اور بعض کثرت کیواسطے یہاں کثرت ہی کے لئے ہے کیونکہ تعداد اور شمار کی ضرورت کثرت ہی کی صورت میں پیش آتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیس روزہ چلہ کشی کا ارادہ کیا وٰعدنا موسیٰ ثلٰثین لیلۃ واتممناھا بعشر، لیکن چونکہ ان سے کوئی فرو گذاشت ہو گئی اس لئے اللہ تعالیٰ نے دس دن اور بڑھادئے، چالیس دن کر دئے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بھی کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بھی غارِ حراء میں چالیس دن تک چلہ کشی کی ہے، مگر یہ روایات ضعیف ہیں، صوفیا بھی طبیعت میں اثر پیدا کرنے کیلئے چالیس روز کی مدت ضروری قرار دیتے ہیں، اور بچے کی تدریجی تخلیق سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انقلاب احوال میں چالیس کے عدد کو بہت بڑا دخل ہے، بہر حال معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اتیں غارِ حراء میں بسر کرتے تھے۔ حدیث میں "اللیالی ذوات العدد" مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ دن میں کہیں اور رہتے تھے، حالانکہ آپؐ دن کو بسا اوقات غارِ حراء میں رہا کرتے تھے؛ اس کے دو جواب ہیں پہلا یہ کہ راتیں چونکہ خلوت و عبادت کیلئے مختص ہیں اس واسطے صرف لیالی کا ذکر کیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ رات کی عبادت سخت اور مشکل ہوتی بمقابلہ دن کی عبادت کے جب آپؐ سخت اور مشکل عبادت اس قدر شوق اور دلجمی سے ادا کرتے ہیں تو دن کی عبادت جو کہ آسان اور سہل ہے وہ از خود مفہوم ہوتی ہے۔ اسی لئے محض لیالی کے ذکر پر اکتفار کیا گیا۔ قبل ان ینزع الی اہلہ ای یشتاق الی اھلہ۔ یتزوّد یہ مدت گذارنے کے لئے کوئی چیز بطور توشہ ہمراہ لیجایا کرتے تھے۔

ایک سوال اور اس کے مختلف جوابات روایت سے معلوم ہوا کہ آپؐ غارِ حراء میں بسا اوقات عبادت کیا کرتے تھے حالانکہ ہنوز عبادت کے طریقوں کا آپؐ کو کوئی علم نہیں تھا۔ اس کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں مشہور جواب یہ ہے کہ آپؐ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے مطابق عبادت کیا کرتے تھے۔ ملت ابراہیمی اسمٰعیل علیہ السلام کی وساطت سے عرب بھر میں پھیل گئی تھی اسی وجہ سے اہل عرب کافی مدت تک ملتِ ابراہیمی کے متبع رہے، لیکن آہستہ آہستہ گمراہی

وسرکشی کے سبب اثرات وہاں کی عام فضا میں تحلیل ہو گئے۔ مگر تاہم کچھ لوگ صحیح طور سے ملتِ ابراہیمی پر عامل تھے۔ آپؐ نے اسی ملت کے موافق عمل کیا۔ دوسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ آپؐ کے قلبِ مبارک میں طرقِ عبادت کا القا کیا گیا جس طرح تخلیہ کو محبوب بنایا گیا تھا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ آپؐ بذریعہ اجتہاد عبادت کیا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ مسئلہ متکلم فیہ ہے کہ پیغمبر اجتہاد کرتا ہے یا نہیں۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ پیغمبر " فیما لم لوحیٰ الیہ " میں اجتہاد کرتا ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ آپؐ کو جو اسمار اور صفاتِ باری معلوم تھیں آپ ان ہی کے ذریعہ عبادت کرتے تھے۔

حتیٰ جاء الحق ای الوحی کو غایت بتلایا گیا ہے مراد جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ فجاء الملک ،، سے اس کی تفسیر کر دی۔ الملک کا الف لام عہد خارجی ہے۔ اربابِ سیرؒ فرماتے ہیں کہ رمضان المبارک کی سترہ تاریخ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال کی تھی۔ فاخذنی فغطنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ دبانا کیوں ہے۔ اور پھر اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے کیسے لگے؟ جواب یہ ہے کہ دبانے سے اللہ کے رسول کو متنبہ کرنا مقصود تھا۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ تنبیہ نہیں بلکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے کمالاتِ پنہاں سے آگاہ کرنا دراصل مقصد تھا۔ آپ روزِ ازل سے نبی ہو چکے تھے "کنت نبیا وآدم بین الماء والطین" آیاتِ قرآنی صاف بتاتی ہیں کہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں گے اور ان پر ایمان لائیں گے۔ نبی آخر الزماں وہی ہو سکتا ہے جو تمام انبیاء کے علوم کا جامع ہو۔ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے اصول تو ایک ہوتے ہیں لیکن شریعتیں جداگانہ۔ ثم جاءکم الرسول مصدق لما معکم ،، معکم سے اسی جامعیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور عوام سے الست بربکم ،، کا عہد لیا گیا ہے۔ تیسرا عہد علماء سے لیا گیا ہے واذ اخذ اللہ میثاقاً من الذین اوتوا الکتٰب الخ اوتوا الکتاب سے مراد علماء کی جماعت ہے، جس سے تبیین کتاب اور عدم کتمان کا عہد لیا گیا ہے۔ اس کا بہت سے لوگوں کو انکار بھی ہے وہ اس سے مراد

محض یہود و نصاریٰ کو لیتے ہیں، بہر حال چیز یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کمالات پر مطلع کرنا چاہتے تھے، جو آپ کے اندر پوشیدہ تھے، مادیت کی راکھ میں چھپے ہوئے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سینے سے دبا کر کمالاتِ پس پردہ کو اجاگر کر دیا، ٹھیک ایسے جیسے پتھر پر پتھر مارنے سے دیا سلائی پر تیلی گھسنے سے آگ روشن ہو جاتی ہے۔ ایک تقریر یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام چاہتے تھے کہ میری روحانی تاثیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رگ و پے میں سرایت کر جائے تاکہ آپ میں اعلیٰ درجہ کی روحانیت آجائے اور قبولِ وحی میں کوئی دقت نہ ہو۔ اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں توجہ کہا جاتا ہے۔ توجہ کی چار قسمیں ہیں۔ انعکاسی، القائی، اصلاحی، اتحادی۔ انعکاسی یہ ہے کہ مرشد کی روح کے اندر جو اثر ہے، ساتھ بیٹھنے والے پر اسکا عکس پڑے اور وہ اس سے اپنے اندر ایک انفعالی کیفیت محسوس کرے بالکل اس طرح جیسے آپ عطر لگا کر کسی مجلس میں بیٹھیں اور مجلس معطر ہو جائے۔ لیکن توجہ انعکاسی میں صاحب طریقہ کا ارادہ شرط نہیں ہوتا۔ یہ سب سے کمزور توجہ کہلاتی ہے کیونکہ اسکا اثر صرف قیام مجلس تک رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ولی اللہ وہ ہے جس کی مجلس میں دنیا سرد پڑ جائے۔ دوسری توجہ القائی ہے اس کے اندر کامل اپنا عمل کرتا ہے یعنی دوسرے پر بالارادہ اثر ڈالتا ہے ٹھیک ایسے ہی جیسے کوئی اپنے چراغ سے بالارادہ دوسرے کے چراغ کو روشن کر دے اس توجہ میں فیض کا القاء ہوتا ہے مرشد سے مسترشد کی جانب اور یہ تاثیر مجلس منتشر ہونے کے بعد بھی رہتی ہے اس لئے یہ پہلی توجہ سے زیادہ قوی ہے لیکن دوسری توجہات کے بہ نسبت یہ بھی ضعیف ہے کیونکہ یہاں معمولی سی ہوا سے چراغ کے بجھ جانے کا اندیشہ ہے، تیسری توجہ اصلاحی ہے اس میں مرشد مسترشد کی جانب قدم اٹھاتا ہے۔ اس کے اعمال و افعال کو درست کرتا ہے پھر اس پر توجہ کرتا ہے جیسے آپ کسی حوض میں پانی لانا چاہتے ہیں۔ تو پہلا کام آپ کا یہ ہوتا ہے

کہ آپ حوض سے ایسی تمام اشیاء کا دفع و انسداد کرتے ہیں جو اسے مکدر کرنے والی ہوں، نیز اس کے نلوں کو صاف کرتے ہیں، تب جاکر کہیں پانی لاتے ہیں۔ اس توجہ میں انعکاسی و القائی سے زیادہ قوت ہے لیکن بجائے خود ایک کمی بھی وہ یہ کہ اس صورت میں جتنا بڑا ظرف ہوگا اتنا ہی فیض آئیگا، اس سے زیادہ نہیں، حضرت مجدد والف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس توجہ میں شیخ کو تکلیف پہنچی ہے لیکن محبت و ہمدردی کی وجہ سے وہ اسے انگیز کرتا ہے جسطرح بچے کے نجاست آلودہ کپڑے، دھونے میں اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہے مگر اپنی محبت کے باعث وہ سب کچھ برداشت کرتی ہے۔

چوتھی توجہ اتحادی ہے یہ سب سے زیادہ قوی ہے اس میں مرشد مسترشد کی جانب اس طرح متوجہ ہوتا ہے کہ دونوں روحوں میں باہمی عظیم اتحاد اور زبردست ہم آہنگی پیدا ہو جائے جیسی شیر و شکر میں یہی توجہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو مقصود ہے انہوں نے اپنی روحانیت کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں مسامات کے ذریعہ نافذ کر دینا چاہا ہے، دونوں روحوں کو مخلوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب دونوں روحوں میں خاطر خواہ اتحاد پیدا ہو گیا تو قدرتی طور پر آپ کے اندر وہی تمام کمالات آ گئے جو جبرئیل علیہ السلام میں موجود تھے۔ مشائخ متقدمین میں یہ توجہ پائی تو گئی ہے مگر بہت کم۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے یہاں کچھ مہمان آ گئے اور گھر میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جسے کھانے کے طور پر پیش کیا جا سکے خواجہ صاحب بہت پریشان تھے۔ محلہ میں ایک نان بائی کی دوکان تھی، اسے یہ بات معلوم ہوئی تو فوراً ایک سینی میں کھانا لگا کر خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ باقی باللہ یہ دیکھکر بہت خوش ہوئے اور فرمایا جو چاہو مانگ سکتے ہو۔ نان بائی نے کہا بس آپ مجھے اپنا جیسا کر دیجئے۔ یہ سنکر خواجہ صاحب نے فرمایا تم برداشت نہیں کر سکو گے، دوسری چیز طلب کرو! نان بائی مُصِر رہا، خواجہ صاحب نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ خواجہ صاحب اسے اپنے حجرے میں لیگئے اور اس پر اتحادی توجہ ڈالی چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد جو حجرے سے نکلے تو دونوں کی صورت بالکل ایک سی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا

کہ خواجہ صاحب اپنی جگہ مطمئن تھے اور نان بائی کے چہرے پر انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی۔ ظاہر بات ہے جو چیز سالہا سال کی محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوتی ہے اور بتدریج قلب جس کی برداشت کا عادی بنتا ہے۔ وہ کہیں دفعۃً تھوڑی برداشت کیجا سکتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اسی لئے فرمایا تھا کہ تمہارے اندر قوت تحمل نہیں۔ کوئی اور مطالبہ کرو۔ مگر چونکہ وہ باز نہیں آرہا تھا اور خواجہ صاحب وعدہ کر چکے تھے اس لئے خواجہ صاحب نے اس پر اتحادی توجہ منعطف کی، چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ برداشت نہ کر سکا دو تین دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

انعکاسی۔ القائی اور اصلاحی توجہات مشائخ میں کثرت سے پائی گئی ہیں۔ اور آج بھی بزرگوں میں پائی جاتی ہیں شبہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے آپ کو امر بالقرأت کرنا تکلیف مالایطاق ہے جو کہ شریعت کے مزاج کے قطعی خلاف ہے، ناجائز ہے۔ اس کے مختلف جوابات ہیں۔ پہلا جواب جو مشہور اور سہل ہے یہ ہے کہ یہاں امر بابِ تلقین سے ہے بابِ تکلیف سے نہیں اگر استاذ بچے سے پہلے دن کہے کہ پڑھ تو دراصل وہ تلقین کرتا ہے یعنی جو میں پڑھوں تو بھی اس کا تلفظ کر۔ ظاہر ہے کہ اس سے تکلیف مقصود نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جبرئیل علیہ السلام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امر تلقینی کیا۔ آپ نے امر تکلیفی سمجھا اس لئے فرمایا ماانا بقاری،۔ —— دوسرا جواب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا اقرأ فرمانا تکلیفی ہے مگر دوسرے مقدمات جو ہیں وہ تسلیم نہیں کیوں؟ اس لئے کہ ابھی تک احکامات نازل نہیں ہوئے لہذا امر تکلیفی کا ممنوع ہونا ثابت نہیں اور اشاعرہ کے نزدیک شے کا حسن و قبح شرعی ہے، عقلی نہیں۔ بنابریں دلیل عقلی سے اس کے عدم جواز کا ثبوت ملنے سے کوئی نقصان نہیں تیسرا جواب یہ ہے کہ آپ کو مستقبل میں پڑھنے کی تکلیف دی گئی تھی، علی الفور قرأت کا امر نہیں تھا۔ اس صورت میں تکلیف مالایطاق ظاہر ہے کہ لازم نہیں آتی۔ اب اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ "فقال اقرأ" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بظاہر جبرئیل علیہ السلام کی افضلیت مفہوم ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بخاریؒ نے قاعدہ بغدادی جن میاں جی سے پڑھا ہے ظاہر ہے کہ وہ بخاریؒ سے افضل نہیں ہیں حالانکہ استاذ ہیں! اسیطرح حضرت جبرئیل علیہ السلام اگرچہ یہاں جناب رسول اللہ علیہ

وسلم کے معلم ابتدائی ہیں لیکن بعد میں محبوب ربّی الف الف صلوٰۃ علیہ کا مرتبہ ان سے بہت زیادہ بلند ہو گیا یہاں تک کہ آپ ایسے ارفع مقام پر پہنچ گئے جہاں جبرئیل علیہ السلام اپنی بے شمار خصوصیات کے باوجود پر مارنے کی بھی جرأت نہ کر سکے اور نہ ہی کسی نبی کی رسائی ممکن ہو سکی۔

حتی بلغ منی الجہد۔ الجہد منصوب اور مرفوع دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ منصوب ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دبانے کی وجہ سے جبرئیل علیہ السلام کو مشقت ہوئی، اور یہ محل اشکال ہے! اس لئے کہ جبرئیل علیہ السلام ملک ہیں ایک انسان کے مقابلہ میں بے پناہ طاقت رکھتے ہیں یہاں تک کہ ایک چیخ سے قوموں کی قوموں کو برباد کر ڈالا ہے، پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دبانے سے جبرئیل علیہ السلام کو مشقت پہنچے؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام اسوقت چونکہ بصورت بشر ہیں اس لئے طاقت بھی کم ہے مرفوع ہونے کی صورت میں تقدیر یوں ہو گی "حتی بلغ الجہد مبلغہ" اس وقت مشقت کا عروض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو گا۔ اسپر کوئی اشکال نہیں۔ اب ایک بحث یہ رہجاتی ہے کہ "اقرار" فعل متعدی ہے اس کا مفعول کہاں ہے اور کونسا ہے؟ جواب یہ ہے کہ مرسل روایات میں آتا ہے کہ دیباج یا حریر کے ٹکڑے پر لکھی ہوئی یہ آیت جبرئیل علیہ السلام لیکر حاضر ہوئے تھے۔ اب تقدیر عبارت یہ ہو گی اقرار ما کتب علی ہذا الدیباج۔ اس وقت اقرأ بجائے خود قائم رہیگا۔ لیکن بعض وہ حضرات جو احتجاج بالمراسیل کے قائل نہیں کہتے ہیں کہ کبھی کبھی فعل متعدی منزل بمنزلۃ اللازم قرار دیا جاتا ہے وہاں مفعول مطلوب نہیں ہوتا بلکہ محض وجود فعل مقصود ہوتا ہے جیسے ہو الذی اضحک وابکیٰ۔ یہاں مقصود صرف منہ الاضحاک ومنہ الابکیٰ ہے یا جیسے

شجو حسادہ وغیض عدی ان یری مبصر ویسمع واع

اسجگہ مطلقاً وجود رویت اور وجود سماع کو شاعر سبب غیض بتانا چاہتا ہے۔ کسی مفعول خاص کی طلب نہیں ؎

ترے عاشق کا سامو وانہ تو دیکھا نہ سنا چاہتا ہے کہ جہاں میں کوئی دیکھے نہ سنے

تو اسی طرح اقرار کے معنی اوجد القراۃ کے ہیں کسی مخصوص کتاب یا دیباج کی قراۃ مطلوب نہیں ہے۔ اقرار باسم ربک الخ یہ پانچ آئتیں سب سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ اس کے اندر و طیرۂ قرارۃ کو بتایا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرارۃ سے استبعاد تھا، اسکا جواب دیا گیا کہ باسم ربک الذی خلق " یعنی اگر خالق دوجہاں کی مدد تمہاری ساتھ رہی تو کوئی امر مستبعد مستبعد نہیں رہے گا۔ اسیوجہ سے یہاں ب استعانت کی مانی گئی ہے اور چونکہ مقصود وطیرۂ قرارۃ کا تذکرہ ہے۔ اس لئے اقرار کا تذکرہ بھی پہلے کیا گیا۔ اگر آپ کہیں کہ ذات باری تعالیٰ زیادہ اہم ہے اور اہم مقدم ہوتا ہے بایں وجہ " اسم ربک " کو مقدم ہونا چاہیئے تھا۔ تو جواب دیا جائے گا کہ، اسم باری کو اہمیتِ ذاتی ہے اور قراءۃ کو عارضی اس لئے اسے مقدم کیا گیا۔۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ " اقرار باسم ربک " میں لفظ اسم کو کیوں لایا گیا ہے، استعانت اسم سے تو نہیں ہوتی وہ تو ذات سے ہوتی ہے! بعض لوگوں نے جواب میں لفظ اسم کو زاید بتلاتے ہوئے کہا کہ جس طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم " میں اسم زاید ہے اور اس کے اضافہ سے مقصد اشتباہ بالقسم کو ختم کرنا ہے اسیطرح یہاں بھی لفظِ اسم زیادہ ہے۔ لیکن یہ جواب نادرست ہے۔ اسوجہ سے کہ یہاں اشتباہ بالقسم نہیں ہے۔ جواب مختار یہ ہے کہ ذاتِ باری تمام عوالم سے مستغنی ہے اس لئے دونوں ، (انسان اور ذات باری) میں کوئی نسبت نہیں۔ لیکن صفات باری واسطہ بین الخالق والمخلوق ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے قدم اور وجوب کی وجہ سے ذاتِ باری سے تعلق رکھتی ہیں۔ فلاسفہ نے اسکو نہیں سمجھا اور ان کے الجھے ہوئے دماغ اور پراگندہ ذہنیت عقول عشرہ کے واسطوں کی طرف جھک گئی۔ متکلمین اور صوفیاء صفات باری کو واسطہ مانتے ہیں۔ پھر یہاں حقیقت میں تین واسطے ہیں ذاتِ محضہ، صفات، اسماء۔ اسمار کا صدور صفات سے ہے اور صفات کا صدور ذات محضہ سے۔ رزاق اسم باری ہے اسی سے تمام رزقوں کا وجود ہو رہا ہے تو گویا اسمار سے تمام مخلوقات کا وجود ہو رہا ہے لہذا ذات اور اسمار کے درمیان واسطہ صفات ہوئیں اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ اسمار اور صفات۔ ٹھیک اسی طرح اخلاق انسانوں کیلئے

واسطہ بین الروح والاعمال ہیں۔ روح سے اخلاق کا صدور ہوتا ہے اور بعد میں درجہ آتا ہے ہاتھ پاؤں وغیرہ کا۔ اس لئے کہ حقیقت میں اخلاق ہی سبب ہوتا ہے تحریک اعضاء کا۔ مثلاً زید کی روح میں اگر شجاعت وجوانمردی ہے تو یہ اس کو میدان کارزار کی طرف خوشی خوشی لے چلیگی ایسے ہی اگر طبیعت میں سخاوت ہے تو یہ داد ودہش پر مجبور کرے گی۔ ذات باری سب سے مستغنی ہے اور صفات اسمائے الٰہیہ کے واسطے مخلوقات سے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں دراصل تمام مخلوقات کا صدور اسماء ہی کے ذریعہ جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کرتا ہے گویا یہ اسماء اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ اب اسم کا لفظ مقحم نہیں رہا۔ بلکہ گذشتہ تقریر سے معلوم ہوا کہ اسماء میں بھی تاثیر اور قوت ہے اگرچہ ہمارے اسماء میں وہ تاثیر نہیں۔ محققین کہتے ہیں کہ ہم اسمائے باری کو اس طرح اثر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جیسے پانی کے قطروں کو مٹی میں۔ البتہ یہ تاثیر بالواسطہ ہوتی ہے اور جب یہ دریافت ہوگیا کہ اسمائے باری میں قوت و تاثیر ہے تو معلوم ہوا کہ استعانت بھی جائز ہے۔ صوفیاء اسی کے قائل ہیں اور یہی جواب صحیح تر ہے۔ ربک یہاں پر لفظ رب کا استعمال کیا گیا ہے۔ لفظِ اللہ یا لفظِ رحمٰن نہیں لایا گیا؛ وجہ یہ ہے کہ صفاتِ ربوبیت کا مطلب ہے کسی شے کو اس کے کمال منتظر تک پہنچا دینا اور یہ صفت صرف باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ تو مقصد یہ ہے کہ تم رب سے استعانت طلب کرو تاکہ وہ تمہیں تمہارے کمالِ منتظر تک پہنچا دے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ یہاں استبعاد ہو رہا ہے اسلئے لفظِ رب کو استعمال کیا گیا تاکہ آپؐ کا استبعاد رفع ہوجائے۔ الذی خلق خلق کے معنی حقیقی اعطائے وجود کے ہیں، اور کبھی محض تصویر کو بھی خلق کہدیتے ہیں لیکن معنی مجازی کے طور پر یہاں خلق کے پہلے معنی مراد ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتانا ہے کہ جو ذات تمہیں وجود عطا کرسکتی ہے وہ قراءۃ پر بھی قادر بنا سکتی ہے۔

خلق الانسان من علق یہ ایک دوسرے کرشمہ کا ذکر ہے یعنی جو خدا اسباب پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے کہ ارذل المخلوقات سے اشرف المخلوقات کو پیدا کردے۔ کیا وہ تمہیں قراءۃ پر قادر نہیں

بناسکتا؟ علّم بالقلم قلم کی یوں تو کوئی اہمیت نہیں. لیکن چونکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک تمام علوم وفنون کے خزانوں کو محفوظ طریقے سے پہنچایا ہے. اس لئے اس کی اہمیت بڑھ گئی یرجف رجف کپکپی کو کہتے ہیں. کبھی ظاہری جسم میں کپکپاہٹ ہوتی ہے اور کبھی قلب پر لرزہ طاری ہوتا ہے، جو بڑا سخت ہوتا ہے. فوادہ فواد قلب کو کہتے ہیں. بعض لوگوں نے غشائے قلب کو فواد کہا ہے. زملونی تزمیل ازالۂ لرزہ کے لئے کوئی گرم چیز مثلاً کمبل وغیرہ اڑھانا لقد خشیت خشیت کے مفعول کا تذکرہ نہیں. اس سلسلہ میں بعضوں نے من الموت اور بعضوں نے من ان یکون شیطاناً او من انیکون جنوناً وغیرہ احتمالات ذکر کئے ہیں. مگر اقویٰ احتمال وہی ہیں خشیت من الموت یا خشیت من المرض. یہ زیادہ تر راجح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ گھبراہٹ کا اظہار فرمارہے ہیں تو یہ اظہار واقعی تھا یا محض سیاسۃً؟ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ سیاسۃً تھا. اس لئے کہ اگر آپؐ دفعۃً اپنی نبوت کے بارے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے تو ممکن تھا کہ ان کی زبان سے انکار نکل جاتا. اور ظاہر ہے جب گھر والے ہی اپنی بات کا انکار کر بیٹھیں تو بھلا باہر والے اس پر کیوں ایمان لانے لگے! اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح پریشانی اور ہوش ربا گھبراہٹ ظاہر ہوئی تو قدرتی طور سے حضرت خدیجہ کی حمایت آپ کو حاصل ہو گئی اور وہ آپؐ کی مکمل ہمنوا بن گئیں. دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ گھبراہٹ سیاسۃً نہیں بلکہ حقیقۃً تھی. اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی آمد پر اخیر زمانہ تک انتہائی مشقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا درانحالیکہ آپؐ عادی بھی ہو چکے تھے. جب عادت کے باوجود بوقت نزولِ وحی اسقدر گرانی انگیز کرنی پڑتی تھی کہ اونٹنی تک (عظیم الجثہ ہونیکے باوجود) آپؐ کا وزن نہیں سنبھال سکتی تھی. حضرت علی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میری ران پر تھا کہ وحی نازل ہوئی اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری ران ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اسی طرح حضرت جابر یا زید بن ثابت کی پنڈلی پر آپکی پنڈلی پڑگئی تو انھیں یقین ہو گیا کہ اپنی پنڈلی چورا

چورا ہو گئی۔ تو ابتدائے وحی میں آپ کی حالت کا غیر ہو جانا کوئی بعید اور تعجب خیز بات نہیں۔ بلکہ حقیقت ہے۔ انک لتصل الرحم حدیث میں آتا ہے الخلق کلھم عیال اللہ اور آگے آپ فرماتے ہیں کہ جو اپنے عیال پر جتنا احسان کرے وہ خدا کے نزدیک اتنا ہی محبوب ہے" عیال اسے کہتے ہیں جو کسی کی ذمہ داری میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اسکی ہر طرح کی ضروریات پوری کرنیکا خود ذمہ لیا۔ مخلوق سے خالق کو اور مصنوع سے صانع کو ایک گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو بھی اپنی تمام مخلوقات سے ایسی ہی محبت ہے جیسی صاحب عیال کو اپنے عیال سے ہوتی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جو کسی کے عیال سے محبت و ہمدردی رکھتا ہو صاحبِ عیال اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے، اس کی محبت اور انتہائی قدر کرنے لگتا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اسی لئے حضرت خدیجہ فرماتی ہیں کہ آپ لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، مخلوقات سے ہمدردانہ پیش آتے ہیں، اور جو ایسا کرتا ہے وہ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے لہذا باری تعالیٰ آپ کو ہرگز ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ صلہ رحمی بڑا مشکل کام ہے الاقارب کالعقارب" معاملات کی کثرت کی وجہ سے آپسمیں ناقہ چاقی اور گڑبڑ ہوتی رہتی ہے جس سے ایک وقت بہترین معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے چنانچہ صلہ رحمی کی اہمیت کے پیشِ نظر آیات و روایات میں اس کے متعلق بڑی کثرت سے ہدایات مذکور ہیں جن پر زور دیا گیا ہے۔ وتحمل الکل کل کے معنی بار کے آتے ہیں۔ اور بار والا بوجھل کہلاتا ہے یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں یعنی آپ بوجھل آدمیوں (قرض داروں) کو برداشت کرتے ہیں، ان کے قرضوں کو ادا کرتے ہیں ان کے بوجھوں کو ان کے اوپر سے اٹھا کر اپنے اوپر لیلیتے ہیں۔

وتکسب المعدوم۔ کسب جس وقت مفعول واحد کی طرف متعدی ہوتا ہے تو معنی حاصل کرنے کے ہوتے ہیں جیسے یہاں مقصد یہ ہے کہ لوگ مال کو حاصل کرتے ہیں اور آپ معدوم کو یعنی فقر کی وجہ سے جو شخص کالمعدوم ہو گیا اس کے متلاشی رہکر اس کے فقر کو دفع کرتے ہیں اور اگر کسب متعدی بدو مفعول ہو تو وہاں عطا کرنا مقصد ہوتا ہے ایسی صورت میں عبارت

یوں ہوگی تکسب الفقراء المعدوم ای المال المعدوم۔ آپ لوگوں کو وہ مال عطا فرماتے ہیں جو اور دں کے پاس نہیں ہوتا۔ بعض حضرات تکسب المال سے روایت کرتے ہیں وہاں اعطار مراد ہوگا اور ثانی معنی متعین ہوں گے۔ المعدوم کے اندر بھی دو روایتیں ہیں۔ المعدوم اور العدوم۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اپنے اخلاقِ کریمہ سے متمتع اور سودمند فرماتے ہیں۔ وتقری الضیف۔ تقری مجرد سے مہمان داری کے معنی میں ہے۔ اور مزید فیہ سے مہمانی مہیا کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ دونوں روایتیں ہیں۔ اجانب کی مہمان داری کمال کی بات ہے، مہمان نوازی انبیاء علیہم السلام کی سنن میں سے ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ بغیر مہمان کے کھانا ہی نہیں کھایا کرتے تھے۔ ہر دستر خوان پر مہمانوں کا ہونا ضروری تھا۔ آپ ہی سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بطور ورثہ یہ خصوصیت ملی۔ تمام عرب میں خصوصاً قریش، بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب میں یہ صفت اعلیٰ پیمانہ پر پائی جاتی تھی۔ اہل عرب آج تک اس خصوصیت کے حامل ہیں۔

وتعین علی نوائب الحق۔ انما قالت نوائب الحق لانہا تکون فی الحق والباطل۔ نوائب نائبہ کی جمع ہے اس سے مراد مصائب ہیں۔ اس لئے کہ ان کی آمد نوبت بنوبت ہوتی ہے جیسے دوائر۔ نوائب دو طرح کے ہوتے ہیں بعض شر کی وجہ سے پیش آتے ہیں جیسے شراب خوری یا دوسری نفسانی خواہشات کی بدولت مصائب میں مبتلا ہونا۔ اور بعض خیر کی وجہ سے مثلاً مال واسباب کا لٹ جانا یا مکان وغیرہ کا منہدم ہوجانا پہلی صورت نوائب باطلہ کی ہے اور دوسری صورت نوائب حقہ کی آپ کی امداد کا تعلق اسی سے ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا قبل از نبوت کی باتوں سے استدلال کرتی ہیں۔ اور دراصل یہی چیزیں سبب بنی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت خدیجہ کے نکاح کا۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا بیوہ ہیں، لیکن عقل وفہم اور حسن وجمال میں اپنی مثال نہیں رکھتیں قریش کے بڑے بڑے سردار خدیجہ سے نکاح کرنے کی تمنائیں کرتے ہیں، مگر یہ نہایت ذلت سے ان کے پیغامات کو ٹھکرا دیتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم غریب ہیں اور آپ کی عمر

بھی بہت کم ہے۔ لیکن اسکے باوجود خدیجہؓ اپنے غلام سے (جو کہ تجارت کے لئے آنحضور علیہ السلام کے ساتھ شام گئے تھے اور جنہوں نے دیکھا تھا کہ اگر ایک میل آپؐ سواری پر چلتے ہیں تو دوسرے میل مجھے بٹھاتے ہیں، خود پاپیادہ چلتے ہیں۔ حالانکہ جاہلیت کا دور ہے، غلام کو انتہائی ذلیل سمجھا جاتا ہے چہ جائیکہ اسے اپنی سواری پر بٹھایا جائے!) اسی طرح دیکھتے ہیں کہ بادل کا ایک گھرا ٹکڑا آپؐ کے سر مبارک پر برابر سایہ افگن رہتا ہے، آپؐ جس درخت یا پتھر کے سامنے سے گذرتے ہیں تو ان سے السلام علیک یارسول اللہ کی آواز آتی ہے اور پھر شام پہنچتے ہیں تو بہت جلد یکبارگی ہی تمام مال فروخت ہوجاتا ہے اور حیرت انگیز نفع کے ساتھ اس قسم کے واقعات سنکر آپؐ پر فریفتہ ہوجاتی ہیں، یہانتک کہ غلام کے ذریعہ شادی کا پیغام بھیجتی ہیں۔ آپؐ اپنے شفیق چچا ابوطالب سے اسکا تذکرہ فرماتے ہیں۔ ابوطالب کہتے ہیں، بیٹا تم غریب ہو وہ دولت مند ہے، غرور و تکبر کی پتلی ہے۔ اسے اپنے حسن و جمال اور دولت پر گھمنڈ ہے، اس نے بہت سے اونچے اونچے پیغامات ٹھکرا دئے ہیں، وہ تمہیں کیا نظر میں لائیگی؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس نے خود نکاح کی خواہش ظاہر کی ہے۔ چنانچہ ابوطالب اسیوقت آپؐ کو اپنی ہمراہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے یہاں لے گئے اور نکاح کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے پہلی ہی رات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام دولت کا مالک بنادیا و وجدک عائلاً فاغنیٰ سے اسی طرف اشارہ ہے، بہرحال یہاں امور خمسہ کا تذکرہ ہے اور دوسری جگہ تصدق الکلام نیز تؤدی الامانت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہ مکارم اخلاق کے اصول ہیں جو آپؐ کی عادت مبارکہ میں داخل ہیں جن پر ہمیشہ استمرار رہا ہے اب ظاہر ہے کہ جو شخص خلق اللہ سے یوں ہمدردی کرتا ہوا ور خود اپنے نفس کو برائیوں سے محفوظ رکھکر اخلاقِ فاضلہ سے ہمہ وقت متصف رہتا ہو وہ یقیناً وحدہٗ لاشریک کی بے کنار رحمتوں اور غیر متناہی عنایتوں کا مستحق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید اور ہوش ربا اضطراب کو دیکھکر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے کلاَّ، کا استعمال کیا، پھر ما یخزیک کہا اور پھر ابداً کا لفظ بولیں اس کے بعد بطور دلیل آپؐ کے اخلاق فاضلہ کا تذکرہ کیا۔ آگے ازالۂ فزع کے لئے دوسری

ترکیب فرمارہی ہیں۔ چونکہ آپؐ پر اضطراب انتہا کو پہنچا ہوا تھا جسکا اظہار آپ نے "لقد خشیت علی نفسی" سے فرمایا تھا اسی باعث حضرت خدیجہ نے اس کے دفع کے واسطے انکار، اصول بلاغت کے موافق کامل درجہ کا کیا۔ ورقہ ابن نوفل حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی ہیں۔ یہ اور زید ابن عمر ابن نفیل قریشی آپؐ کی بعثت سے پہلے شام کی جانب گئے تھے۔ دین حق کی طلب میں۔ انہوں نے اپنے سابقہ دین کو غلط اور باطل سمجھا اس لئے انھیں دین حق کی طلب محسوس ہوئی۔ زید ابن عمر اس سلسلہ میں ایک مشہور یہودی عالم سے ملے، اس نے اپنے دین کی طرف رغبت دلائی اور کہا کہ اس میں اتنی بات ضرور ہے کہ غضب خداوندی کا ایک حصہ قبول کرنا پڑے گا۔ یہ سنکر زید ابن عمر بولے کہ اسی سے تو بھاگ کر آرہا ہوں، یہ ایک نصرانی عالم کی طرف رجوع ہوئے اس نے کہا، لن تدخل فی دیننا حتی تاخذ حظا من الضلالۃ،، زید ابن عمر نے اسے بھی رد کر دیا۔ نصرانی نے دین حنیف قبول کرنے کی بابت کہا یہ مکہ لوٹ آئے اور دین ابراہیمی کے باقی ماندہ دھندلے ہی نقشہ پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ورقہ شام پہنچکر علمائے نصاریٰ سے ملے جنہوں نے تحریف فی الدین نہیں کی تھی۔ ان سے نصرانیت کی تعلیم حاصل کی اور عبرانی زبان میں کافی مہارت حاصل کر لی یہانتک کہ عربی میں ترجمہ کی صلاحیت پیدا ہو گئی، اس مہارت کی وجہ سے یہ کتب سابقہ سے پوری طرح واقف تھے۔

اسمع من ابن اخیک اس میں دو احتمال ہیں اما باعتبار الاحترام فظاہر واما باعتبار القرابۃ فلانّ قرابۃ عبد المناف وعبد العزیٰ علیٰ ماقیل ھی ان الاب الثالث بورقۃ کان اخا للاب الرابع لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ھٰذا الناموس ناموس اور جاسوس صاحب سر کو کہتے ہیں۔ بعضوں نے فرق کیا ہے۔ کہ ناموس راز دار خیر کو اور جاسوس راز دار شر کو کہتے ہیں۔ ناموس اکبر جبرئیل علیہ السلام کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ راز و نیاز کی باتیں جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے انبیا علیہم السلام کے پاس لاتے رہے ہیں۔ نزل اللہ علیٰ موسیٰ۔ یہاں پر ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ ورقہ کی نصرانیت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ علیٰ عیسیٰ کہتے انہوں نے علیٰ موسیٰ کیوں کہا؟ جواب

یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت وعظمت تمام اہل کتاب کے یہاں متفق تھی، مسلّم تھی بخلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے کیونکہ اس میں یہودیوں کو اختلاف تھا۔ یا اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اکثر احکام پر مشتمل تھی (بخلاف حضرت عیسیٰ کے) اور جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب بھی اکثر احکام پر مشتمل ہے۔ یا اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون پر عذاب کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اسیطرح اس امت کے فرعون یعنی ابوجہل لعین پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عذاب کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں۔ یا اس وجہ سے کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے ملتی جلتی تھی، بخلاف عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے یہاں عدم تشدد کا فلسفہ کارفرما تھا۔ حضور کی چودہ سال تک یہی (عدم تشدد) سیاست و پالیسی رہی اس کے بعد آپ کے یہاں بھی جہاد کا حکم نافذ ہو گیا جس کی وجہ سے آپ کی شریعت حضرت موسیٰ کی شریعت سے قریب تر ہو گئی۔ یہ ہے وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام لئے جانیکی ورقہ کو اس کا علم کتب سابقہ کی پیشین گوئیوں سے ہو گیا تھا۔

یالیتنی فیہا جذعًا فیہا سے مراد فی ایام الدعوت ہے۔ آپ نبی ہو چکے ہیں لیکن پہلی دعوت کا حکم ابھی تک آپ کو نہیں ہوا، جو زمانہ دعوت کا ہوتا ہے وہی در اصل عداوت کا بھی ہوا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے زید اور ورقہ کو آپ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ خود موحد تھے قریش کو غلطی پر سمجھتے تھے مگر توحید کی طرف دعوت نہیں دیتے تھے۔ تین سال تک فترت وحی کا زمانہ رہا اس کے بعد یا ایہا المدثر قم فانذر الخ کا حکم نازل ہوا چنانچہ جس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا کام شروع کیا تو زندگی کے اُفق پر قہر وستم کی بجلیاں کوندنے لگیں، بام ودر مخالف ہو گئے۔ یہاں فیہا کی ضمیر کا مرجع مذکور نہیں اسپر نحوی نقطۂ نگاہ سے اشکال ہو سکتا ہے۔ جواب دیجئے کہ یہ مفہوم عن الاسباق ہے اس لئے لفظاً مرجع کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ جذعہ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو چوتھے سال سے گذر کر پانچویں میں داخل ہو گیا ہو، اس کی قوت ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کاش میں ان دنوں میں بالکل جوان ہوتا۔ او مخرجی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اخراج پر تعجب دو وجہوں سے ہوا، ایک

یہ کہ مکہ ایام جاہلیت ہی سے حرم ہے، دار الامن ہے، مکہ کی چہار جانب خوفناک جنگیں ہوتی تھیں لیکن مکہ کی فضا بالکل مامون اور خوشگوار رہتی تھی۔ پھر جبکہ میں کسی سے لڑوں گا نہیں، کسی کو ستاؤں گا نہیں۔ آخر وہ لوگ کس بنا پر مجھے میرے مسکن سے نکالینگے!

دوسری وجہ استعجاب کی یہ تھی کہ مکہ کے سارے خاندانوں سے آپؐ کی قرابت تھی، عزیزداری تھی اور عرب کی خصوصیت تھی کہ وہ اپنی قرابت پر جانیں لڑا دیتے تھے۔ آپؐ کو حیرت ہوئی کہ ہمارے رشتہ دار ہو کر ہمیں نکالنا کیسے گوارا کریں گے! "او مخرجیّ" میں ہمزہ استفہام کا ہے اور معطوف علیہ اس کا مدخول محذوف ہے۔ تقدیر عبارت ہے امعادی ہم ومخرجیّ ہم۔ مخرجیّ کی اصل مخرجون تھی، مضاف الی یار المتکلم ہے معلل ہو کر مخرجیّ ہوگیا۔ لم یات رجل بمثل ما جئت بہ "ما جئت" ماضی کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ یہاں مستقبل کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ وجہ یہ ہے کہ آپؐ کا یہ لانا متیقن تھا، اور امر متیقن ماضی میں ہوا کرتا ہے مستقبل میں نہیں۔ اس لئے لفظ ماضی بولے۔ وفتر الوحی فترتِ وحی کے زمانہ میں آپؐ پر شدید اضطراب کا عالم رہا اگرچہ وحی آپؐ کے لئے کافی تکلیف دہ تھی لیکن وہ تکلیف ایسی تھی جسے لذت آفریں کہنا چاہیئے چنانچہ شدت رغبت اور انتہائی کرب و بےچینی کی وجہ سے آپؐ نے پہاڑ پر جا کر خودکشی کا ارادہ فرمایا لیکن فوراً جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر آپؐ نے ارادہ ختم کردیا۔ فاذا الملک آگے آپؐ فرماتے ہیں فرعبت منہ یہ رعب یا تو واقعہ اولی کی وجہ سے ہوا یا چونکہ اس وقت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصلی شکل میں تھے۔ بعض روایات میں قد سد الافق کے الفاظ ملتے ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دو مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے ایک تو یہاں اور دوسری بار لیلۃ المعراج میں۔ حمی او حی حمی کے معنی گرم ہونے کے ہیں نیز کثرت کو بھی حمی سے تعبیر کرتے ہیں حمی السوق وغیرہ کی اصطلاحیں بولی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہاں کثرت وحی کو حمی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تابعہ عبد اللہ بن یوسف اگر کوئی دوسرا راوی بھی ہمارے استاذ کی طرح روایت کرے تو یہ متابعت کہلاتی ہے۔ متابعت کبھی سند میں ہوتی ہے اور کبھی متن میں پہلی متابعت اعرف و اشہر ہے

متابعت کی دو قسمیں ہیں اگر راوی متابع خود اس کی موافقت کرے یعنی پوری سند ایک ہو، استاذ دونوں کے ایک ہوں تو یہ متابعت تامہ کہلاتی ہے۔ اور اگر سند آگے چل کر متحد ہو تو متابعتِ ناقصہ کہلاتی ہے۔ مصنف رح کبھی کبھی متابعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ متابعات کی وجہ سے روایات میں قوت آجاتی ہے۔ جس وقت متابعت تامہ ہوگی اُس وقت محض ضمیر لائیں گے۔ اور مراد یہ ہوگی کہ اس نے میرے استاذ کی متابعت کی اگر متابعت ناقصہ ہو تو متابع لہٗ کو بھی ذکر کریں گے۔ جیسے تابعہٗ ہلال ابن ردادعن الزہری کے اندر ہے۔ بوادِر جمع ہے بادرہ کی بادرہ اس گوشت کو کہتے ہیں جو دونوں کاندھوں کے درمیان ہو۔

ترجمۃ الباب سے روایت کے تطابق کو ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ باب بدءُ الوحی سے متعلق قائم کیا گیا ہے۔ اور بدء الوحی کا تذکرہ صراحۃً اور مطابقۃً موجود ہے کیونکہ رویائے صالحہ کے ابتدائے وحی میں سے ہونے میں کوئی شک ہی نہیں۔ حقیقت میں یہی تو عالم غیب کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ تھا۔ پھر خلوت و تنہائی کا اختیار کرنا، ناموس اکبر کا آنا اور اخلاقِ فاضلہ کا پایا جانا یہ سب مبادیِ وحی میں سے ہیں۔ نیز لوگوں کا آپ کے ساتھ بغض و عداوت سے پیش آنا بھی مبادیِ وحی میں سے ہے۔

حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل ..... ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اس آیت کی تفسیر میں لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے نازل ہونے کی وجہ سے سخت تکلیف انگیز کرتے تھے اور یہ تکلیف ہونٹوں کے ہلانے سے ہوتی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے تلامذہ سے کہا کہ میں اپنے لبوں کو تمہارے لئے ہلاتا ہوں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرکت دیتے تھے۔ اور سعید نے کہا میں ان دونوں لبوں کو اس طرح ہلاتا ہوں جیسے کہ میں نے ابن عباس کو ہلاتے دیکھا ہے۔ پھر انہوں نے دونوں لبوں کو ہلایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان

علینا جمعہ وقرآنہ اس کی تفسیر میں ابن عباسؓ نے کہا ہے، قرآن کریم کا آپؐ کے سینے میں جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے اور آپؐ اس کو پڑھینگے۔ پس جبکہ ہم اس کو پڑھیں تو آپؐ ہمارے پڑھنے کی پیروی کیجئے۔ ابن عباس نے کہا کہ اس کو سن اور خاموش رہ پھر ہمارے ذمہ اس کا بیان کرنا ہے ثم ان علینا بیانہ یعنی اس کا پڑھانا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ ہوگیا کہ جب جبرئیل علیہ السلام تشریف لاتے آپؐ خاموشی کے ساتھ سماعت فرماتے اور جب جبرئیل چلے جاتے تو آپؐ اس کی قرأۃ فرماتے جبرئیل علیہ السلام کی طرح + ترجمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ" کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنزیل وحی کی وجہ سے مشقت کے متحمل ہوتے تھے اس کو برداشت کرتے تھے، فرماتے تھے، کان یعالج اس سے مراد تحمل ہے، شدت کے معنی مشقت کے ہیں۔ جن لوگوں نے من کو ابتدائے غایت کے لئے مانا ہے ان کے نزدیک تقدیر عبارت یوں ہوگی کان ذالک المعالجۃ مبتدا، من تحریک شفتیہ۔ من کو سببیہ تسلیم کرنے کی صورت میں بھی حاصل یہی ہوتا ہے کہ تحریک شفتین کی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشقت ہوتی تھی۔ یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ تمام حروف تو شفوی نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے حروف ایسے ہیں کہ ان کی ادائیگی کے وقت تحریک شفتین کی حاجت نہیں پڑتی اس لئے مایحرک شفتیہ، کہنا کیسے درست ہوگا؟ مناسب یہ تھا کہ مایحرک لسانہ" لایا جاتا جواب کے اندر دو توجیہیں ہیں۔ پہلی توجیہ یہ ہے کہ یہ باب ذکر البعض وارادۃ الکل سے ہے شفتیہ بولکر مراد فم لیا گیا ہے۔ دوسری توجیہ ہے کہ یہ بابِ الاکتفاء سے ہے، باب الاکتفاء میں امور متعددہ میں سے کسی ایک کو ذکر کر کے دوسری چیزوں سے اعراض کیا جاتا ہے جیسے سرابیل تقیکم الحر میں محض حر کا ذکر ہے حالانکہ ارادے میں برد بھی داخل ہے۔ اسی طرح فرمایا گیا رب المشارق حالانکہ وہ رب المغارب بھی ہے۔ محض اکتفاء بذکر المشارق، مغارب کو حذف کر دیا گیا اور

عموماً یہ بات عطف میں ہوتی ہے، تو اسیطرح یہاں بھی "یحرک شفتیۃ" سے لسانہ عبارت ہے مگر لسانہ کو حذف کر دیا گیا اکتفار بذکر شفتیہ. یہی توجیہ راجح ہے. وکان مما یحرک یہ جملہ تفسیر ہے جملہ اولی کی یعنی یعالج الخ کی ابتدائے وحی کے دور میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل علیہ السلام کی آواز بھی سنتے تھے اور پڑھے بھی جاتے تھے. قاعدہ ہے کہ مکرر سہ کرر پڑھنے سے بات پوری طرح ذہن نشین ہوجاتی ہے. آپ نے خیال فرمایا کہ اگر میں صرف سنتا رہوں تو ہوسکتا ہے کہ بھول جاؤں اس خوف کی وجہ سے آپؐ سنتے بھی جاتے تھے اور پڑھتے بھی جاتے تھے بایں وجہ مشقت اور بڑھ جاتی تھی. وقال سعید. اسجگہ طرزِ عبارت میں تبدیلی ہوگئی. کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں فانا احرکہا لک کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحرکہا، اور سعید نے کہا انا احرکہا کما رئیت ابن عباسؓ یحرکہا تو ابن عباس نے تحریک رسول کو مُشبَّہ بنایا اور اس کے متعلق خود کو رُویت حاصل ہے یا نہیں، اس کا ذکر نہیں کیا. اور سعید نے رُویتِ ابن عباسؓ کا صراحتہً تذکرہ کیا ہے. غالباً اس کی توجیہ یہ ہے کہ ابن عباس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو نہیں دیکھا، اس لئے کہ یہ واقعہ بدءُ الوحی کے وقت کا ہے اور اُس وقت ان کی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی. یہ مرسل صحابی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رئیت نہیں فرمایا. ایک صورت یہ بھی ہے کہ ابن عباسؓ نے یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقلاً عن الواقعۃ الاولٰی سنی اور آپؐ نے تحریک کر کے دکھلائی اس وقت ابن عباسؓ کو رائیت کہنے کا حق تھا لیکن انہوں نے اختصاراً اسے ترک کر دیا.

لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ یہاں شبہ ہوتا ہے کہ مفسِر اور مفسَر میں انطباق نہیں ہے اس لئے کہ مفسَر میں لسان اور تفسیر میں ذکر شفتیہ ہے؟ اس کی توجیہ یا تو یوں کیجئے کہ شفتیہ سے بوجہ قرب وجوار لسان مراد ہے. یا بطور ذکر البعض وارادۃ العام لسان بھی داخل فی المراد ہے یا بطور اکتفار ایسا کیا گیا ہے. جب آپؐ کو تحریک لسان سے منع کر دیا گیا تو سوال پیدا ہوا کہ یہ آیات محفوظ کیسے رہیں گی؟ فرمایا گیا ان علینا جمعہ وقرآنہ، اس کی ذمہ دار ہم ہیں کہ یہ آیتیں

تمہارے سینے میں جمع کر دیں، محفوظ کر دیں۔ پھر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے آیات کے جمع اور محفوظ ہو جانے کے بعد قراۃ نہ کی جا سکے اس کی بھی ذمہ داری لیلی گئی۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان علینا جمعہ وقرآنہ کی تفسیر میں جمعہ لک فی صدرک فرمایا گویا قوتِ حافظہ صدور کو مانا۔ فلاسفہ قوتِ حافظہ ان تجاویف میں سے ایک جوف کو مانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے سر میں ودیعت رکھے ہیں اور متکلمین واصولیین ہر چیز کا اصل منبع قلب کو مانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ، باری تعالیٰ دماغ سے حفظ کا کام لیتے ہوں، لیکن حقیقت اس کی قلب ہی میں پنہاں ہے اور قلب صدور میں ہے۔ اسی لئے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فی صدرک فرمایا۔

فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ یہاں اگرچہ قاری جبرئیل علیہ السلام ہیں لیکن باعتبار اسنادِ مجازی کے اللہ تبارک و تعالیٰ جل مجدہٗ کی جانب قراءت منسوب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قراۃ جبرئیل کے وقت بعض الفاظ مشکلہ سننے میں آتے تھے۔ آپ فوراً پوچھ بیٹھتے تھے۔ اس وجہ سے فرمایا گیا ثم ان علینا بیانہ یعنی اگر درمیان میں کچھ مشکل باتیں پیش آجائیں تو آپ اسی وقت دریافت نہ فرمایا کیجئے۔ فراغت کے بعد اس کا بیان ہم کریں گے حضرت ابن عباسؓ نے بیانہٗ کی تفسیر تقرأہ کے ساتھ کی ہے۔ ان کے علاوہ اور لوگوں نے تفصیل مجملات سے کی یہاں دو شبہے واقع ہوتے ہیں، ایک شبہ نظم قرآنی پر جس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ آیت سورہ قیامتہ کی ہے۔ اس سورت کو سورہ قیامہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسی کے اندر قیامتِ صغریٰ اور قیامتِ کبریٰ دونوں کا تذکرہ ہے۔ لااقسم بیوم القیامتہ سے ابتدار کی گئی ہے اور قیامت ہی سے متعلق اس میں دوسرے مباحث ذکر کئے گئے ہیں۔ آگے چل کر یہ آیت شروع ہو جاتی ہے اور پھر اس کے بعد کلا بل تحبون العاجلۃ آیت شروع ہوتی ہے تو یہ آیت (لاتحرک بہ لسانک) درمیان میں لائی گئی دراںحالیکہ اس کو نہ تو پہلی آیت سے ربط ہے اور نہ بعد کی آیت سے، جواب اس کا یہ ہے کہ تقدیم وتاخیر ہی کو علت عذاب فی القیامتہ آیت کے اندر ذکر کیا گیا ہے بما قدم واخر۔ یہاں ایک اعتراض پڑتا ہے کہ دنیا وآخرت میں اطاعتِ خدا اور اطاعتِ نفس کے

اندر تو تقدیم و تاخیر سمجھ میں آتی ہے، لیکن اگر ہم اطاعت ہی کو عمل میں لائیں، فرمابرداری ہی ہمارا شعار بن جائے اور نفسانی اغراض سے ہم اس قدر پرہیز کرنے لگیں کہ گویا وہ ہم میں ہیں ہی نہیں، تو ان اطاعتوں میں، ان احکامات و مامورات کے بجالانے میں تقدیم و تاخیر کو باعث مواخذہ نہ ہونا چاہیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہی کر رہے تھے اس لئے کہ آپؐ پر قرآن کا سننا اسے حفظ کرنا یہ سب امور ضروری تھے، اگر ان میں تقدیم و تاخیر ہو گئی تو اس پر کوئی مواخذہ ہونا چاہیئے یا نہیں؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا تھا جواب کے طور پر یہ آیت آئی کہ ہر چیز میں تقدیم و تاخیر کا خیال ناگزیر ہے۔ یہ جائز نہیں کہ مصلی سجدہ پہلے کرے اور رکوع بعد میں۔ معلوم ہوا کہ اس آیت کو ماقبل و مابعد سے ربط ہے کیونکہ بعد میں کہا گیا ہے بل تحبون العاجلۃ وتذرون الاخرۃ ـــ اب سوال یہ ہے کہ روایت کو ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے؟ یہاں تو ابتدائے وحی کی کیفیت کا تذکرہ نہیں۔ جواب میں کہئے کہ ترجمۃ الباب سے مطابقت بھی ہے، مناسبت بھی روایت سے معلوم ہوا کہ آیت کے نزول سے پہلے ابتدائی وحی کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت رہا کرتی تھی۔ مگر چونکہ اتنی مناسبت سے بخاری رحمہ اللہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا، کیونکہ مصنفؒ کا مقصد عظمتِ وحی کو بیان کرنا ہے۔ لہٰذا جواب یوں دیجئے کہ روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ وحی کی حفاظت فی قوۃ الحافظہ اور حفظ فی القراءۃ اور حفظ فی البیان کے ذمہ دار ہیں، اس بنا پر ہرگز ممکن نہیں کہ اس میں کوئی باطل چیز آجائے۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ، معلوم ہوا کہ وحی امر محفوظ من کل الوجوہ ہے، لہٰذا عظمتِ وحی ثابت ہو گئی۔

حدثنا عبدان قال اخبرنا عبداللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخاوت میں تمام انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے اور اپنی حالت سے زیادہ سخی آپؐ رمضان میں اس وقت ہوتے تھے جبکہ جبرئیل علیہ السلام آپؐ سے ملاقات کرتے تھے۔ اور جبرئیل علیہ السلام رمضان کی

ہر رات میں آپؐ سے ملاقات کرتے تھے، اور آپؐ سے قرآن کا دور کرتے تھے پس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوائے مرسلہ سے زیادہ سخی تھے۔ ترجمہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں میں سب سے زیادہ سخی بتایا گیا ہے حالانکہ آپؐ کی ساری زندگی فقر و فاقہ میں بسر ہوئی ہے۔ ابتدائی زندگی اور ابتدائی دور تو خیر فقر و فاقہ کا دور تھا ہی لیکن وفات کے قریب جبکہ آپؐ کی حکومت قائم ہو چکی تھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپؐ بھوک کی وجہ سے کروٹیں بدلا کرتے تھے،، تو غرض یہ ہے کہ جود مال پر مبنی ہے اور یہاں مال کا فقدان ہے؟ جواب یہ ہے کہ حقیقت میں جود کا انحصار مال پر تو ہے لیکن اس کے جمع کرنے پر تو نہیں بلاشبہ آپؐ کے پاس جمع شدہ مال نہیں رہتا تھا۔ آپؐ کا طریقہ تھا کہ ادھر مال آیا اُدھر فوراً خرچ کر ڈالا سوائے اس مال کے جسے ادائے قرض کی خاطر رکھ لیا جاتا تھا۔ آپؐ نے کبھی دراہم و دنانیر کو رات بھر گھر میں نہیں رکھا۔ تو دراصل آپؐ کا فقر قلتِ مال کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ خرچ کی فراوانی کی وجہ سے تھا، دریا دلی کی وجہ سے تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ کے پاس بحرین سے ایک لاکھ دراہم آئے مسجد میں آپؐ کے روبرو ڈھیر لگا دیا گیا آپؐ نے اسی وقت ایک ایک کر کے تقسیم کر دئے معلوم ہوا کہ جود صرف مال پر مبنی نہیں بلکہ اس کے ساتھ غنائے نفس بھی ضروری ہے روایت میں ہے کہ آپؐ نے سائل کے جواب میں کبھی لا نہیں فرمایا، ہمیشہ اس کے سوال کو پورا کیا، اپنے پاس ہوا اسے دیکر ورنہ قرض لیکر اور کبھی دوسرے وقت دینے کا وعدہ فرمالیا۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ عرض کیا یا رسول اللہ قرض لیکر سائل کو دینا تو آپؐ پر واجب نہیں۔ یہ سنکر آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ الناس اس سے مراد فقط اہل عرب ہیں یا تمام دنیا والے بہر حال آپؐ کا یہ وصف تمام نوع انسانی سے بڑھکر ہے۔

وکان اجود ما یکون رمضان کے مہینے میں جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کی سخاوت بھی انتہائی کمال کو پہنچ جاتی ہے، جہنم کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھولدئے جاتے ہیں خیر خیر کی ندا دی جاتی ہے بہت سے دوزخی بہشتی بنا دئے جاتے ہیں۔ قرآن بھی اسی

مہینہ میں نازل ہوا ہے۔ اسی ماہ میں شب قدر ہونیکی غالب امید ہے۔ روحانی افاضات میں رمضان کا مہینہ ایسا ہی ہے جیسے مادی افاضات میں ساون کا خوشگوار مہینہ۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ ابتدائے شعبان سے روحانی بارش شروع ہوجاتی ہے جیسے اساڑھ سے مادی بارش ہونے لگتی ہے اور پھر جس طرح مادی بارش بھادوں میں پورے شباب پر آجاتی ہے اسیطرح نصف شعبان کے بعد سے روحانی بارش میں زیادتی ہوتی ہے، یہ زیادتی بتدریج رمضان کے دوسرے عشرے تک جاری رہتی ہے اور پھر تیسرے عشرے میں بارش اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اعتکاف رمضان کے عشرے اخیرہ میں کہا گیا ہے۔ باری تعالی کے اس کثرت جود کی بنار پر قرآن حکیم کا نزول رمضان المبارک میں ہوا، اور اس کے تمام انعامات میں سب سے بڑا انعام یہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن جناب حق تعالیٰ کی صفت ہے، انعامات بخشنا کوئی بڑی بات نہیں لیکن اپنی صفت دیدینا بہت بڑی بات ہے۔ ان تمام اسباب کی بنار پر یہ مہینہ باری تعالیٰ کی جود وسخاوت کا حسین مظہر ہے۔ اور فرمایا گیا تخلقوا باخلاق اللہ" اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اس کا اثر پڑا اور آپ کی سخاوت کا مرکز بھی یہی مہینہ بنا۔ فی رمضان یہ حال ہے اور قائم مقام خبر کے ہے۔ الفیہ ابن مالک میں حال سدمسد الخبر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حین یلقاہ جبرئیل جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم کا دور کرانے کے لئے رات کے وقت آتے تھے۔ اس لئے انعام باری اور جود باری کا مظاہرہ رات میں زیادہ ہوتا ہے، اسی باعث جناب رسول اللہ کی صفت جود لیالئ رمضان میں اور فزوں ہوجاتی تھی فیدارسہ القرآن ہمیشہ رمضان کی راتوں میں مدارست قرآن منزل فی ازمن الماضی،، ہوا کرتی تھی، یہ مدارست اس ذمہ داری کی وجہ سے تھی جسکا باری سبحانہ وتعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون،، اس کی تفصیل گذشتہ تقریر میں گذر چکی ہے

اجود بالخیر خیر سے مراد عام ہے۔ دینوی بھی۔ اخروی بھی۔ مادی بھی، روحانی بھی۔ من الریح المرسلہ ریح مرسلہ اس تیز ہوا کو کہتے ہیں جو لوگوں کے منافع کے لئے بھیجی جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ روایت کے اندر رجوعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان کیا گیا ہے اور ترجمۃ الباب بدء الوحی ہے۔ دونوں میں آخر کیا مناسبت ہوئی؟ دلالتِ مطابقی کے اعتبار سے تو مناسبت ہے ہی نہیں لیکن معنی التزامی سے بھی کوئی مناسبت سمجھ میں نہیں آتی! جواب یہ ہے کہ اہلِ سئیر نے روایت کی ہے کہ سترہ رمضان کو غارِ حرا میں وحی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ نازل ہوئی لیکن شروطِ بخاری پر روایت پوری نہ اترنے کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں کی جا سکتی تھی، اس لئے مصنفؒ نے یہ روایت پیش کی جس سے اتنا علم ہوجاتا ہے کہ بابِ مدارست رمضان شریف میں واقع کیا گیا اور اس سے قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ ابتدائے وحی بھی ضرور بالضرور رمضان ہی میں ہوئی ہوگی۔ وحی کا مبدء مکانی پہلے معلوم ہوگیا تھا، اب مبدء زمانی کا علم بھی ہوگیا۔ اس کو معنی مطابقی سے بالکل مناسبت ہے اور معنی التزامی سے مناسبت یوں دریافت ہوتی ہے کہ روایت نے بتلایا آپ پر وحی ایک ہی بار نازل نہیں ہوئی بلکہ بار بار ہوتی رہی ہے اور مدارست وتکرار ہر رمضان میں ہوا ہے اس سے اس کی کمال حفظ پر دلیل قائم ہوگئی اور عظمتِ وحی کا پتہ چلا اب انس کے تنسون سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ممکن ہے آپؐ نے کچھ بھلا دیا ہو۔

حدثنا ابو الیمان الحکم بن نافع..... عبداللہ ابن عباس نے خبر دی کہا کہ خبر دی مجھے ابوسفیان ابن حرب نے کہ ہرقل نے مجھے بمعہ قریش کے چند سواروں کے بلایا، یہ لوگ اس زمانہ میں جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور کفارِ قریش سے حدیبیہ میں صلح کی تھی، تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے، پس یہ حاضر ہوئے، اس وقت ہرقل اور دوسرے امراء ایلیا (بیت المقدس) میں مقیم تھے۔ پھر ہرقل نے انھیں اپنی مجلس میں بلایا اور ترجمان کو طلب کیا اس وقت اس کے قریب عظمائے روم کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ پس ہرقل نے ابوسفیان وغیرہ سے کہا کہ تم لوگوں میں اس پیغمبر کے نسباً کون شخص زیادہ قریب ہے؟ قال ابوسفیان فقلت انا اقربھم نسباً ہرقل نے اپنے

آدمیوں سے کہا کہ اس کو میرے قریب لے آؤ اور اس کے ساتھیوں کو برابر پیچھے کی جانب بٹھاؤ، ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان کے ساتھیوں سے کہدو میں اس شخص سے کچھ سوالات کرتا ہوں اگر یہ جھوٹ بولے تو تم اس کی تکذیب کرنا. ابوسفیان کہتا ہے قسم بخدا اگر دروغ گو مشہور ہونیکا خطرہ نہ ہوتا تو میں محمد کے بارے میں ضرور جھوٹ بولتا۔ پھر ہرقل نے تمام باتوں سے قبل یہ دریافت کیا کہ اس پیغمبر کا حسب نسب تم لوگوں میں کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ ہمارے میں نہایت شریف اور بہترین خاندان سے ہے. ہرقل نے پوچھا کیا پہلے تمہارے میں سے بھی یہ دعویٰ کسی نے کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں. ہرقل نے پوچھا کیا اس کے باپ دادوں میں کوئی صاحب حکومت بھی گذرا ہے؟ میں نے کہا نہیں. ہرقل نے پوچھا بڑے لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں یا چھوٹے؟ میں نے کہا چھوٹے. ہرقل نے پوچھا اس کے رفقا بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے؟ میں نے کہا بڑھتے جاتے ہیں. ہرقل نے پوچھا اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کیا کوئی شخص مرتد بھی ہو جاتا ہے، ناخوش ہو کر؟ میں نے کہا نہیں ہرقل نے پوچھا کیا تم نے اس پر جھوٹ کی تہمت بھی لگائی ہے اس کے دعویٰ نبوت سے قبل؟ میں نے کہا نہیں. ہرقل نے پوچھا کیا اس سے دغابازی بھی سرزد ہوتی ہے؟ میں نے کہا نہیں. البتہ ان دنوں ہمارے اور اس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے اب دیکھئے اس میں کیا کرنے والا ہے (ابوسفیان کہتا ہے اس جملہ کے سوا اپنی خواہش سے میں پوری گفتگو میں کوئی بات نہ کہہ سکا) ہرقل نے پوچھا تمہارے اور اس کے درمیان کبھی جنگ بھی ہوئی ہے؟ میں نے کہا نعم. ہرقل نے پوچھا لڑائی کا رنگ کیا رہا؟ میں نے کہا جنگ ہمارے اور اس کے مابین ڈول کی طرح ہے کبھی نوبت ہماری ہے اور کبھی اس کی (یعنی کبھی ہمیں غلبہ ہوتا ہے اور کبھی اس کو) ہرقل نے پوچھا وہ تمہیں کس بات کا امر کرتا ہے؟ میں نے

کہا وہ کہتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو، اور اپنے باپ دادوں کی بات کو نہ مانو۔ اور وہ ہمیں نماز کا، صدق کا، پرہیزگاری کا اور صلہ رحمی کا حکم کرتا ہے۔ پس ہرقل نے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہدے میں نے تجھ سے اس کے نسب کے بارے میں دریافت کیا، تو نے بتلایا کہ وہ ہمارے میں عالی خاندان ہے۔ سو پیغمبر اپنی قوم میں اعلیٰ ہی نسبت ہوتے ہیں۔ میں نے تجھ سے پوچھا کسی نے پہلے تمہارے میں سے بھی یہ دعویٰ کیا ہے، تو نے ذکر کیا کہ نہیں۔ سو یہ دعویٰ اگر کسی نے پہلے کیا ہوتا تو میں سمجھتا یہ شخص اپنے اسلاف میں سے کسی کے دعویٰ کی پیروی کر رہا ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ کیا اس کے باپ دادوں میں کوئی بادشاہ تھا، تو نے کہا کہ نہیں سو اگر کوئی بادشاہ ہوا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ شخص نبوت کی آڑ میں باپ دادے کی سلطنت چاہتا ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ نبوت سے قبل کبھی اسکا جھوٹ بھی ثابت ہوا ہے، تو نے کہا کہ نہیں تو میں نے سمجھا کہ جو شخص کبھی لوگوں پر جھوٹ نہیں بولتا وہ بھلا خدا پر کیسے جھوٹ بولیگا میں نے تجھ سے پوچھا کہ بڑے آدمی اس کی اتباع کر رہے ہیں یا چھوٹے، تو نے کہا کہ چھوٹے۔ سو اولاً چھوٹے ہی لوگ رسولوں کی اتباع کرتے ہیں۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ اس کے آدمی زیادہ ہوتے ہیں یا کم، تو نے جواب دیا زیادہ ہوتے ہیں۔ سو ایمان کی یہی بات ہے، اس کو ترقی ہی ہوتی ہے حتیٰ کہ کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ کیا لوگ اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد ناخوش ہو کر مرتد ہو جاتے ہیں تو نے کہا کہ نہیں۔ سو ایمان ایسی ہی چیز ہے جب دل میں اس کی بشاشت اور تراوت آجاتی ہے تو وہ نکلا نہیں کرتا۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ وہ دغا تو نہیں کرتا۔ تو نے کہا کہ نہیں۔ سو پیغمبروں کی یہی عادت ہوتی ہے۔ وہ ہرگز دغا نہیں کرتے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ وہ تم لوگوں کو کیا حکم کرتا ہے، تو نے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور بت پرستی سے روکتا ہے۔ نماز کا حکم کرتا ہے، صدق
اور پرہیز گاری کا حکم کرتا ہے۔ ہرقل نے کہا کہ یہ باتیں جو تونے کہی ہیں اگر حق ہیں
تو بہت جلد وہ میرے قدموں کی جگہ کا مالک ہوجائے گا۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ
اس وقت پیغمبر ظاہر ہوا چاہتا ہے۔ لیکن میرا خیال یہ نہ تھا کہ وہ تم عربوں میں ہوگا۔
اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس تک پہنچ سکوں گا، تو اس کی زیارت کی خاطر تکلیف انگیز کرتا
اور اگر میں اس کے پاس ہوتا تو ضرور اس کے پاؤں دھوتا اس کے بعد ہرقل نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی منگایا، جو آپؐ نے دحیہ کلبی کے ہاتھ والی
بصریٰ کی طرف بھیجا تھا جسے والی بصریٰ نے ہرقل تک پہنچادیا تھا، ہرقل نے اس کو پڑھا
اس میں تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ خط اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی
جانب سے ہے ہرقل والی روم کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جو متبع ہدایت ہے۔
امابعد میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کرتا کہ دین و دنیا کے اندر
باعزت رہے۔ اسلام کے دامن سے وابستہ ہوجا خدا تجھے دوہرا اجر عطا فرمائیگا
اور اگر تونے اسلام قبول نہ کیا تو تمام رعیت کا گناہ تیرے سر رہے گا۔
"یا اہل الکتٰب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ
بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون"
ابوسفیان نے کہا جب اس نے یہ بات کہی اور خط کے پڑھنے سے فارغ ہوا تو اہل
دربار میں بہت شور مچا، آوازیں بلند ہوئیں۔ اور ہم دربار سے باہر نکالدئے گئے۔ میں
نے دربار سے باہر آتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کا مقام اس
قدر بلند ہوگیا کہ شہنشاہ روم بھی اس سے خائف ہے۔ سو مجھے یقین ہوگیا تھا آپؐ
بہت جلد سب پر غالب آئیں گے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام میں داخل
کردیا ــــ ابن ناطور جو بیت المقدس اور نصاریٰ شام کا پیشوا اور ہرقل کا

مصاحب تھا، وہ بیان کرتا تھا کہ جس وقت ہرقل بیت المقدس میں آیا تو ایک روز اس کی حالت بڑی گڑبڑ ہوئی، اس کے بعض صلاح کاروں نے کہا کہ ہم آپ کو پریشان دیکھتے ہیں؟ ابن ناطور کہتا ہے کہ ہرقل کاہن تھا نجوم کے ذریعہ باتیں بتلاتا تھا ان لوگوں کے سوال پر اس نے کہا آج رات میں نے نجوم میں دیکھا کہ ختنہ کرانے والے لوگوں کا بادشاہ ظاہر ہوا ہے مجھے بتلاؤ کون لوگ ختنہ کراتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا سوائے یہود کے اور کوئی ختنہ نہیں کراتا۔ آپ ان کی وجہ سے غم والم میں نہ پڑیں، اپنے نائبوں کو لکھ دیں کہ جو شخص ان میں یہودی ہو اس کو قتل کر ڈالیں۔ اسی اثناء میں ہرقل کے پاس ملک غسان کا بھیجا ہوا ایک شخص آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اطلاع دینے لگا۔ ہرقل نے جب اس سے تمام باتیں معلوم کر لیں تو کہا کہ اس کو ایک طرف لیجاؤ اور دیکھو یہ شخص ختنہ کرائے ہوئے ہے یا نہیں؟ پس ان لوگوں نے دیکھا اور ہرقل سے کہا کہ یہ مختتن ہے ہرقل نے اس شخص سے عرب کے بارے میں دریافت کیا، اس نے کہا وہ سب ختنہ کراتے ہیں۔ پھر ہرقل نے کہا یہ (جسکا حال میں نے نجوم میں دیکھا ہے) اس امت کا بادشاہ ظاہر ہوا ہے پھر ہرقل نے اپنے دوست ضغاطر کے نام جو رومیہ میں رہتا تھا اسی سلسلہ میں خط لکھا وہ بھی علم نجوم میں ہرقل جیسا قابل تھا۔ اور ہرقل حمص کی طرف چلا گیا، ابھی اسے حمص میں کچھ ہی دن گذرے تھے کہ اس کو دوست ضغاطر کا خط آیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خروج میں اور نیز آپؐ کے نبی ہونے میں ہرقل کی رائے کے موافق تھا۔ ہرقل نے روم کے سرداروں کو حمص کے ایک محل میں جمع ہو جانے کا اذن دیا۔ اور حکم کیا کہ محل کے دروازے بند کر دئے جائیں، اس کے بعد ہرقل نے بلند جگہ پر کھڑے ہو کر کہا یا معشر الروم! اگر تم دین دنیا کی بہترائی اور ہدایت چاہتے ہو، اور اپنی حکومت قائم رکھنے کی خواہش رکھتے ہو، تو اس پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کر لو! اس پر روم کے سردار بھڑک اٹھے اور گورخروں کی طرح ہرقل

کی طرف دوڑے، مگر تمام دروازے بند پائے۔ جب ہرقل نے اُن کی نفرت کی یہ
حالت دیکھی اور ان کے ایمان سے بالکل مایوس ہوگیا تو ان سے کہا میں نے یہ بات اسلئے
کہی تھی تاکہ معلوم ہوسکے تم لوگ اپنے دین میں کسقدر محکم ہو۔ پس (یہ سنکر) تمام لوگ
ہرقل کے آگے سجدے میں گر گئے اور اپنی رضامندی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ ہرقل کا آخری
حال ہے، ابوعبداللہ نے کہا کہ اس کو صالح ابن کیسان اور یونس و معمر نے زہری سے
روایت کیا ہے۔

یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے ۵ھ میں غزوۂ خندق پیش آیا۔ قریش نے اس غزوہ
میں اسلام کے مقدس وفا شعار اور خلوص کیش انسانوں کو مٹانے کی آرزو میں تمام امکانی طاقتیں
صرف کردیں اللہ کے ان باغیوں میں چار ہزار مکہ کے آزمودۂ جنگ اور باقی آٹھ ہزار دوسرے
قبائل کے پختہ کار خونی افراد شامل تھے، مدینہ کی کل آبادی بھی اس قدر نہیں تھی۔ غرور و تکبر
کے مارے، فہم و شعور سے عاری لوگوں نے بڑے گھمنڈ کے ساتھ یہ چڑھائی کی تھی اور نہ
جانے ان کمینوں نے بزعم خود کیسے کیسے خطرناک منصوبے بنا رکھے ہوں گے۔ مدینہ کے باغات
تو آپسمیں تقسیم کرہی لئے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت دیکھکر تدبیر کے طور
پر مدینہ کے اس طرف خندق کھدوائی جس طرف سے طاغوتیوں کے گھس آنے کا اندیشہ تھا۔
دراصل یہ طریقہ فارس والوں کا تھا، اہل عرب اس طرح کی لڑائی سے واقف نہ تھے۔ مدینہ کی
تین سمتوں سے دشمن کے حملہ کا اندیشہ نہ تھا۔ ان راستوں سے آمدورفت سخت دشوار تھی کیونکہ
یہ راستے مسلسل دیواروں، گھنے درختوں اور چٹانوں کے سلسلوں کے سبب ایسے تھے کہ ان راستوں
سے اچانک ہجوم کی شکل میں حملہ نہ ہوسکتا تھا۔ صرف ایک راستہ جانب شمال و مغرب کا ایسا تھا جس
سے آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ آپؐ نے اسی جانب خندق کھدوائی جو کافی چوڑی اور گہری
تھی گھاٹیوں پر لشکر متعین کردیا گیا، پہرے بٹھادئے گئے۔ اللہ کے دشمنوں کو خندق عبور کرنیکی
جدوجہد میں سخت دشواری پیش آئی، اگر کوئی ہمت کرکے آگے بڑھا بھی تو مجاہدین کے باطل

شکن تیروں نے اسے وہیں الٹ دیا۔ چنانچہ اٹھائیس یا انتیس روز تک تقریباً یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس قدر کثیر آدمیوں کے کھانے پینے اور ان کے دوسرے اخراجات نے قریش کو سراسیمہ کردیا۔ ان کے حوصلے پست ہوگئے، کمر ٹوٹ گئی، جس کا انجام شکست تھی جو ہو کر رہی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ اے اللہ اخلاص مندوں کی مدد فرما۔ اپنے ان بندوں کی اس سے زیادہ آزمائش نہ کر۔ تیری ہی خاطر آج یہ تیرے بندے محو جان نثاری ہیں۔ الٰہی ان کے سروں سے ابتلائیں اور ہجوم کفر کی ساری بلائیں دور فرما دے۔ الٰہی طاقت کفر میں ایک ایسا زلزلہ آئے کہ ان میں دوسری مرتبہ جمع ہونے کا حوصلہ نہ رہے۔" چنانچہ وہ زبردست آندھی آئی کہ کفار کے اوسان باختہ ہوگئے، وہ یہ سمجھے کہ قیامت آرہی ہے۔ بیچارے آئے تھے اللہ کے رسول اور آپؐ کے ہمنواؤں کا نام و نشان مٹانے وہاں اپنی ہی جان بچانی دوبھر ہوگئی۔ بالآخر سیاہ بختوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال بعد عمرہ کا ارادہ کیا اور مکہ تشریف لے گئے۔ اہل مکہ آپؐ کی راہ میں مزاحم ہوئے آخر کار باہمی ایک معاہدہ ہوگیا۔ اب شام کا راستہ صاف تھا لوگ تجارت کی غرض سے آنے جانے لگے۔ ابو سفیان اور متعدد اشخاص تجارتی سلسلہ میں شام پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد شاہان عالم کے نام دعوت نامے ارسال کئے۔ مصر اور ایران وغیرہ کا نام اس فہرست میں ملتا ہے، لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے ہندوستان اور چین بھی خطوط بھیجے ہیں۔ چین جانے والے قاصد جب واپس لوٹے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوچکا تھا وہ قاصد پھر وہیں (چین) چلے گئے۔ اور تادم زیست تبلیغی فرائض انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب "مجموعۃ الوثائق السیاسیہ" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے سارے خطوط دعوت نامے اور عہد نامے جمع کئے ہیں۔ اس کتاب کا نیا ایڈیشن مزید اضافوں کے ساتھ مصر میں شائع ہوچکا ہے پہلے بھی یہ کتاب مصر ہی سے شائع ہوئی تھی اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۰ء یا ۱۹۴۲ء میں منظر عام پر آیا

ہے اس ایڈیشن میں ہندوستان و چین کا کوئی تذکرہ نہیں، اب خدا جانے دوسرے اُیڈیشن میں بھی ان ممالک کا ذکر ہے یا نہیں اردو میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوھاروی نے ایک کتاب "بلاغ مبین" کے نام سے لکھی ہے جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب کو جمع کیا ہے، لیکن اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مستقل تصنیف ہے یا حمید اللہ صاحب ہی کی کتاب کا ترجمہ۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل شاہ روم کے نام خط لکھا ہرقل کی کسریٰ سے لڑائی چلی آرہی تھی۔ اس نے نذر مانی تھی کہ اگر مجھے فتح ہوئی تو میں بیت المقدس پیدل چلکر جاؤں گا مصر کے بادشاہ کے نام آپؐ نے بواسطہ گورنر شام مکتوب ارسال فرمایا، ہرقل کو جب آپؐ کا نامۂ مبارک ملا تو اُس نے آپؐ کے حالات معلوم کرنے چاہے۔ اس کے لئے اس نے عرب کے رہنے والے لوگوں کو تلاش کرایا۔ معلوم ہوا کہ قریش تاجروں کا ایک قافلہ تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس کے قریب "غزہ" میں ٹھیرا ہوا ہے جس کے سردار ابو سفیان ہیں، ہرقل نے امراء، پادریوں اور راہبوں کی ایک مجلس منعقد کی، عرب تاجروں اور ترجمان کو طلب کیا۔ اور اس کے بعد وہ گفتگو ہوئی جو روایت میں منقول ہے۔

عبد مناف کے چار بیٹے ہیں عبد شمس نوفل ہاشم مطلب۔ آپ ہاشم کی اولاد میں سے ہیں۔ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب میں ہمیشہ اتفاق و اتحاد رہا ہے، زمانہ جاہلیت میں بھی اور زمانہ اسلام میں بھی اور عبد شمس اور نوفل ایک ساتھ رہے ہیں، انہوں نے بنی ہاشم سے علیحدہ راہ اختیار کی۔ عبد شمس کے بیٹے کا نام امیہ ہے۔ ابو سفیان انہی کی اولاد سے ہیں۔ بنو امیہ نے ہمیشہ بنو ہاشم سے مخالفت رکھی۔ بنو امیہ اپنے دوسرے چچاؤں کے اعتبار سے مال و رجال میں بڑھکر تھے۔ اسی لئے وہ بنو ہاشم اور بنو نوفل کو دبانا چاہتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ بس ہم ہی غالب ہو کر رہیں۔ لیکن اخلاقی حالات بنو ہاشم کے اچھے تھے۔ اسی وجہ سے انھیں عام مقبولیت حاصل تھی۔ جب ان لوگوں نے بنو ہاشم میں اسلام کو آتے ہوئے دیکھا تو ان کی وہ جاہلی عصبیت اور تیز

ہوگئی۔ غزوۂ احد اور غزوۂ خندق میں ابوسفیان ہی نے لشکرِ کفار کی قیادت کا فرض انجام دیا، فوج کی کمان کی۔

ہرقل، روم، شام اور ایشیائے کوچک کا شہنشاہ ہے۔ بہت بہادر اور سمجھدار ہے۔ ایلیا، بیت المقدس کو کہتے ہیں۔ آیل عبرانی زبان میں اللہ کا نام ہے۔ اور یا، کے معنی بیت کے ہیں۔ ذو نسب نسب نکرہ استعمال کیا گیا ہے۔ نکرہ کبھی تعظیم کے لئے بھی آتا ہے جیسا کہ یہاں ہے۔ دوسری روایت میں اس صفت کی تصریح کی گئی ہے۔ فہل قال ہذا القول منکم احد قط قبلہ اس پر نحوی نقطۂ نگاہ سے اشکال ہوتا ہے کہ قط تاکید نفی کے لئے آتا ہے اور یہاں ایجاب ہے؟ جواب دیا گیا کہ استفہام کی جانب ثانی یعنی ہل قال احد منکم ہذا ام لم یقل قط" کی تاکید قط سے کی گئی ہے۔ قلت لا اس لئے کہ عرب مستعربہ میں کوئی نبی نہیں گذرا تھا۔ اس سے پہلے ہود تبعؑ وغیرہ علیہم السلام گذرے تھے مگر ان کا ذکر نسیاً منسیا کے درجہ میں تھا۔ بل ضعفاءہم اگرچہ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اشراف مکہ ایمان لا چکے تھے، مگر اکثریت تنگدستوں اور غلاموں پر مشتمل تھی۔ ہل کنتم تتہمونہ بالکذب یہاں ہل کذبتم نہیں کہا بلکہ سوال اتہام کذب کے بارے میں کیا ہے۔ اصل میں سوال لازم سے ہے۔ اور مراد ملزوم ہے۔ جب آپؐ متہم نہیں تو کاذب بدرجہ اولیٰ نہیں ہوں گے۔ فہل یغدر زمانہ ماضی کے اعتبار سے تو ایجاب نفی میں جواب دیا جا سکتا ہے لیکن مستقبل کے اعتبار سے نہیں کہا جا سکتا، اس لئے ابوسفیان کو اپنی خواہش کے مطابق ایک غلط بات داخل کرنے کا موقعہ مل گیا اور کہا کہ اب جو ہمارے اور ان کے درمیان عہد ہوا ہے۔ اس کے بارے میں ہم نہیں جانتے وہ کیا کریں گے۔ آیا ایفائے عہد یا عہد شکنی" حالانکہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے پوری طرح واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ بے پناہ گندے اور خطرناک ماحول میں آنکھ کھولنے اور پرورش پانے کے باوجود کبھی آپؐ کا دامن کسی عیب سے ملوث نہیں ہوا۔ بے حیائی کے اس عالم میں کہ جہاں عورتیں تک بالکل برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد آپؐ کو کسی نے برہنہ نہیں دیکھا۔ جوے کو آپؐ نے ہاتھ

تک نہیں لگایا، شراب کے پاس نہیں گئے، درانحالیکہ یہ چیزیں اس وقت کی تہذیب خیال کی جاتی تھیں، سنگدلوں کے درمیان آپؐ ایسے رحم دل کے ہر ایک کے دکھ درد میں برابر شریک یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنا آپؐ اپنا فرض سمجھتے تھے، آپؐ نے دوسروں کی خاطر دکھ اٹھائے لیکن آپؐ سے کسی کو دکھ نہیں پہنچا، اپنی قوم میں فساد ، خونریزی کی گرم بازاری دیکھکر آپؐ کو سخت اذیت محسوس ہوتی تھی۔ آپؐ ہمیشہ مصالحت کی کوششوں میں رہتے تھے جس ظالم قوم نے آپؐ کے جسم اطہر پر نوکیلے پتھروں کے منہ برسائے، آپؐ کے جاں نثار اصحاب پر دہ ہیبت ناک مظالم روا رکھے جس سے درندگی بھی شرما گئی۔ لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کے اختیارات حاصل ہو جانے کے بعد بھی سب کو معاف کر دیا، آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، آپؐ کی صداقت پر ساری قوم نے گواہی دی آپؐ کے کسی بدترین دشمن نے بھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ فلاں موقعہ پر جھوٹ بولے ہیں آپ نے کسی سے بدمعاملگی نہیں کی، کسی کی حق تلفی نہیں کی ساری قوم آپؐ کو امین کے معزز لقب سے پکارتی ہے، دشمن تک دوستوں اور قرابت داروں کو چھوڑ کر اپنے قیمتی مال رکھوانے آپؐ کے پاس آتے ہیں اور آپؐ ان کے مال کی جان سے زیادہ حفاظت کرتے ہیں۔

یہ تھی آپؐ کی روشن اور تابناک زندگی جس سے ابوسفیان بخوبی واقف تھے، ظاہر بات ہے جس شخص کے حالات اس قسم کے ہوں، جس کی زندگی اس قدر پاکیزہ اور ستھری ہو اس کے بارے میں آخر کیسے شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ آئندہ ایفائے عہد کریں گے یا بدعہدی؟

فہل قاتلتموہ ہل قاتلکم نہیں کہا اس لئے کہ پیغمبروں کی عادت اپنی قوم سے ابتدار بالقتال کی نہیں ہوتی۔ سجال سجل بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں، عرب کے کنویں بڑے گہرے ہوتے تھے۔ تین تین چار چار آدمی مل کر ڈول کھینچتے تھے، ڈول بھی بہت بڑے بڑے ہوتے تھے۔ ہر شخص اپنا اپنا حوض بنا کر بھر لیتا تھا، یہ باری باری پانی بھرنا اور اپنے حوضوں میں ڈالنا مساجلہ کہلاتا ہے تو جسطرح یہاں کبھی ایک حوض بھرتا ہے اور کبھی دوسرا ابوسفیان

کہتے ہیں بالکل اسی طرح ہماری جنگوں کا معاملہ ہے کبھی ہم مغلوب ہوتے ہیں اور کبھی وہ "
ہرقل نے اپنے سوالات کے بعد اس کی وجہ بیان کی کہ میں نے پیغمبر کے نسب کے متعلق اسلئے
دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے وہ رسولوں کو اعلیٰ نسل میں پیدا فرماتا ہے تاکہ اس
میں خاندانی لحاظ سے کوئی شوشہ نہ نکالا جاسکے۔ لِئَلَّا یَکُونَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃ " اسی لئے پیغمبر
کو نہ کسی ایسی بیماری میں مبعوث کیا گیا جس سے لوگ نفرت کرتے ہوں، دامن بچاتے ہوں۔
لو کان احد قال ہذا القول دنیا دار لوگ انبیاء علیہم السلام کی وجاہت وعظمت اور بلندئ
مرتبہ کو دیکھکر نبوت کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور مرزا غلام احمد قادیانی
اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں تو اہل حرص وہوس کا یہ دعویٰ نبی کی عظمت کو دیکھکر ہوتا ہے اور یہاں
ایسا ہے ہی نہیں لہذا اسکا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ہی اگر کسی بادشاہ کی حکومت وسلطنت
ختم ہوجاتی ہے تو اوّل اوّل وہ خود اور آخر آخر اس کی نسل سے پیدا ہونے والا ہر باشعور
اور حساس آدمی اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل کرنے کی تا دم آخر ہر ممکن کوشش کرتا ہے تاریخی
واقعات اس پر شاہد ہیں۔ جب اس خاندان میں کوئی بادشاہ ہوا ہی نہیں تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں
کہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنیکی جستجو میں ہے۔
قتال والا سوال یہاں مذکور نہیں ظاہر یہ ہے کہ یہ روایت مختصر ہے کتاب الجہاد میں بھی یہ
روایت مذکور ہے وہاں ہرقل کا قول " ایسا ہی ہوا کرتا ہے لیکن نتیجہ انبیاء کے حق میں رہتا
ہے" نقل کیا گیا ہے۔ ہرقل نے اس کو بھی آپؐ کے نبی ہونیکی علامت اور دلیل سمجھا۔ فسیملک
موضع قدمی ہاتین مراد اس سے شام ہے یا ہرقل کی پوری حکومت۔ یہ علم اُس کو کتب سابقہ
کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس دور میں صرف دو آدمی اعلم بالکتب السابقہ سمجھے جاتے تھے ایک تو
یہی ہرقل دوسرا رومۃ الکبریٰ کا رہنے والا ایک شخص تھا جسکا تذکرہ آگے آئیگا انشاء اللہ۔ ولم
اکن اظن انہ منکم یہ اس کی غلطی تھی یا تعصب، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "من اخوانکم "
فرمایا تھا۔ اگر یہ نبی اسرائیل میں سے ہوتے تو حضرت موسےٰ کو منکم فرمانا چاہیئے تھا۔ دوسرے یہ کہ

جبل ابو قبیس کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ ہرقل کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ اگرچہ اس کی باتوں سے ایمان کا شبہ ہوتا ہے لیکن بعد کے اعمال یعنی مسلمانوں پر اس کا حملہ کرنا وغیرہ صاف بتلا رہے ہیں کہ وہ کافر تھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ یقینی طور پر اسلام کی حقانیت کا قائل نہیں تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جہاں بھی خطوط ارسال فرمائے سب میں اپنا نام پہلے لکھا ہے، ہرقل مقوقس اور نجاشی وغیرہ نے اسکا کوئی اثر نہیں لیا، لیکن پرویز (شاہ فارس) یہ دیکھکر کہ ابتدا میرے نام سے نہیں کی گئی آتش بزیر پا ہو گیا۔ مارے طیش کے ظالم حواس کھو بیٹھا اور آپ کے نامۂ گرامی کو پرزہ پرزہ کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا مزّق کل ممزق چنانچہ گستاخ کچھ دن بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا، اور اس کا خاندان بھی زیادہ مدت تک حکومت نہ کر سکا صرف چودہ سال کے اندر اندر پورا کا پورا تباہ ہو گیا۔ پرویز نے جس وقت حالات نہایت بگڑے ہوئے دیکھے اور اسے اپنے قتل ہونے کا مکمل یقین ہو گیا تو اس نے یہ کیا کہ ایک ڈبیہ میں زہر رکھکر اسپر لکھدیا "ہذا دوار نافع للجماع" اور اسے اپنے خاص دواخانے میں رکھوا دیا۔ پرویز کا بیٹا شیرویہ (جس نے پرویز کو قتل کیا تھا) انتہائی شہوت پرست تھا۔ اس کی شہوت کا اندازہ مؤرخین کے اس کلام سے ہو سکتا ہے کہ شیرویہ اپنے باپ خسرو پرویز کی بیوی شیریں یعنی اپنی سوتیلی ماں پر بری طرح عاشق تھا لیکن شیریں کسی طرح رام نہ ہوتی تھی، شیرویہ نے یہ سمجھا کہ شاید پرویز کے بعد یہ مسئلہ حل ہو جائے اس لئے اس کو قتل کر دیا۔ شیرویہ کو پرویز کے خصوصی دواخانے سے وہی ڈبیہ ملی۔ یہ اسے دیکھکر بہت خوش ہوا اور دوا رکے دھوکہ میں زہر کھا گیا نتیجہ وہی ہوا جو زہر کھانے کے بعد ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد بوران اس کی بیٹی تخت پر بٹھائی گئی یہ چونکہ عورت اور پھر کم عمر تھی اس لئے حکومت کو نہ سنبھال سکی آخر کار مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

الیٰ ہرقل عظیم الروم آپ نے اپنے مکتوب میں ہرقل کی کوئی مدح سرائی نہیں فرمائی بلکہ سلام کا لفظ بھی اسطرح ارشاد فرمایا ہے "سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ" اسلم تسلم ای ان

اسلم تسلم فی الدنیا فلا تفضح فی الاخرۃ تنجو عن النار وتدخل الجنۃ،، کتابی کے ایمان پر ڈبل اجر کا وعدہ فرمایا گیا ایک اجر تو اپنے پیغمبر کی اتباع کا اور دوسرا اجر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا۔ فارتفعت الاصوات ہرقل کی مجلس میں جو معزز لوگ بیٹھے ہوئے تھے انھیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ہرقل مسلمان نہ ہو جائے اس وجہ سے ان لوگوں نے شور وغل برپا کر دیا ہرقل کو یہ ڈر ہوا کہ ایسا نہ ہو کہیں یہ لوگ ابو سفیان اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو قتل کر ڈالیں!اس خوف سے ہرقل نے ابو سفیان وغیرہ کو وہاں سے بحفاظت جلد نکالدیا۔ ابو سفیان کو یہ نقشہ دیکھکر بڑا تعجب ہوا کیونکہ ہرقل کی طاقت کوئی معمولی طاقت نہ تھی کہ عربوں اور خصوصًا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (جو بظاہر بالکل بے سروسامان تھے) اس قدر مرعوب ہو جاتی،اسی کو ابو سفیان کہتے ہیں لقد امر امر ابن ابی کبشۃ انہ یخافہ ملک بنی الاصفر حضرت آمنہ کے والد کا نام وہب تھا اور وہب کے والد یعنی آپؐ کے نانا کا نام ابو کبشہ تھا۔بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ابو کبشہ ایک شخص تھا جس نے بتوں کی پرستش میں، قریش کی مخالفت کی تھی۔ بعضوں نے کہا ہے کہ ابو کبشہ حلیمہ سعدیہ کے والد کی کنیت تھی۔ بنی اصفر رومیوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ ابو کبشہ نے آبائی دین کو چھوڑ دیا تھا، کواکب پرستی اختیار کر لی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آبائی غلط دین پر نفریں بھیجی تھیں صرف اتنے سے اتفاق کی وجہ سے کفار آپؐ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے، یہاں ابن ابی کبشہ کا یہی مطلب ہے۔ ابو سفیان کو چونکہ نبی علیہ السلام کی تعظیم کرنا مقصود نہیں بلکہ توہین مقصود ہے۔ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی کی توہین کرتے تھے تو اس کی نسبت خاندان کے کسی غیر معروف شخص کی طرف کر دیا کرتے تھے۔ بہرحال ابو سفیان کو بہت جلد آپؐ کے غلبہ کا یقین ہو گیا تھا۔ البتہ آپؐ کے دین کے حق ہونے کا یقین نہیں ہوا تھا۔

سنہ ۶ ھ میں صلح حدیبیہ دس سال کے لئے ہوئی تھی حدیبیہ مکہ سے تقریبًا ایک منزل کی دوری پر ایک کنواں ہے اسکی وجہ سے گاؤں کا نام بھی حدیبیہ پڑ گیا نبی کریم

علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مکہ معظمہ کا ارادہ فرمایا۔ آپ کی ہمراہ چودہ پندرہ سو افراد پر مشتمل صحابہ رضوان اللہ علیہم کی ایک جماعت بھی تھی، حدیبیہ پہنچکر آپ نے حضرت عثمان رضہ کو مکہ بھیجا تاکہ مشرکین مکہ کو معلوم ہوجائے کہ اس وقت ہماری آمد محض عمرہ اور زیارت کعبہ کی غرض سے ہے کفار نے حضرت عثمان کو روک لیا ادھر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان کو قتل کردیا گیا۔ رسول اللہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے صحابہ سے جہاد پر بیعت لی جس کو "بیعتِ رضوان" کہا جاتا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی بلکہ قریش نے سہل ابن عمرو کو صلح کے لئے بھیجا اور دس برس کے لئے باہمی جنگ نہ کرنیکا معاہدہ ہوگیا، ابھی دو ہی سال گذرنے پائے تھے کہ قریش نے اپنے حلیفوں کی ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلفاء پر حملہ کردیا اور حدودِ حرم تک گھس آئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے اعلان فرمادیا کہ قریش کے نقضِ عہد کی وجہ سے معاہدہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے اسلامی فوجوں کو مکہ کی جانب نقل وحرکت کا حکم دیدیا چنانچہ جس رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے ابوسفیان حکیم ابن حزام اور بدیل ابن ورقہ آپ کی تجسس کے لئے نکلے اور لشکر اسلام جہاں ٹھہرا ہوا تھا اس کے قریب ایک ٹیلہ پر چھپ کر بیٹھ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے ارشاد فرمایا کہ سب لوگ اپنا چولہا الگ جلائیں" اس میں سیاست یہ تھی کہ دشمن کے جاسوس جس وقت دیکھیں (کیونکہ ایسے موقعوں پر جاسوسوں کا ہونا ضرور ہوتا ہے) تو انھیں لشکر کی تعداد اصل سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی دے۔ چنانچہ ابوسفیان وغیرہ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو بڑے متعجب ہوئے کہ محمد کے ساتھ اتنی زبردست فوج! یہ تینوں بیٹھے ہوئے اسی قسم کی باتیں کررہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواسیس آپہنچے اور ٹیلے کا محاصرہ کرکے انھیں اپنی حراست میں لے لیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی اس وقت آنحضور کی جانب سے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، بالآخر یہ کہ حضرت عباس ابوسفیان کو اپنی سواری پر بٹھاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلے۔ راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملے

اور ابوسفیان کو دیکھتے ہی برہنہ شمشیر لئے ہوئے ان کی طرف لپکے حضرت عباس نے سواری کو تیز گام کردیا، عمر نہ پکڑ سکے، لیکن تاہم حضرت عمر تعاقب کرتے رہے اور پکار پکار کر کہتے رہے کہ یہ، ابوسفیان ہے اس کو پکڑ لو اور قتل کر ڈالو، حتیٰ کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اسی طرح کہتے رہے آنحضور علیہ السلام نے ابوسفیان کا گریبان پکڑ کر کہا کیا تم اب بھی ایمان نہیں لاؤ گے؟ ابوسفیان نے جب یہ دیکھا کہ جان بخشی کی صرف یہی صورت ہے، تو ایمان لے آئے۔ ان کا واقعہ دوسری جگہ تفصیل سے آئے گا۔ پس رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ابوسفیان کو لیکر فلاں گھاٹی پر کھڑے ہو جاؤ اور پھر قبائل کے لوگ اشعار حربیہ پڑھتے ہوئے اس گھاٹی سے گذریں، چنانچہ آپؐ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ اخیر میں انصار کی جماعت گذری، اس کے سردار سعد ابن عبادہؓ گذرے، بہت سے کلمات شجاعت کہتے ہوئے اور رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے۔

ابوسفیان نے اندر اندر بڑے پیچ و تاب کھائے لیکن احساسِ بے بال و پری سے گھٹ کر رہ گئے۔ اور انھیں یقین ہو گیا کہ آج گذشتہ تمام عداوتوں کا بدلہ لیا جائے گا۔ پوری قوم کا غصہ مجھ پر اُتارا جائے گا۔ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ دیکھیے سعدؓ ابھی الیوم تستحل الکعبہ اور اسی قسم کے دوسرے نعرے لگاتے ہوئے گذر رہے ہیں حالانکہ سب ہی لوگ حرم کو آمن سمجھتے ہیں، آنحضورؐ نے یہ سنکر اور پس پردہ مصلحت کی بنا پر سعد کو ان کے عہدے سے معزول کر دیا اور ان کے بیٹے قیس کو انصار کا امیر بنا دیا۔ اس بات سے ابو سفیان کے قلب پر گہرا اثر پڑا کہ ہماری شکایت کا کسقدر خیال کیا گیا، نبی کریم علیہ السلام نے یہ اور اسی قسم کی دوسری سیاسی تدبیریں اختیار کیں تاکہ اہل مکہ از خود ہتیار ڈالدیں اور مکہ کے اندر جنگ و جدال کی نوبت نہ آئے۔ سب سے آخیر میں جب مہاجرین کا گروہ اس گھاٹی سے (جہاں ابوسفیان کھڑے تھے) گذرنے لگا جسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھے، تو آپؐ نے فرمایا اے ابوسفیان ہم تمہارا اکرام کرتے ہیں آپ نے اعلان فرما دیا من دخل دار ابی سفیان فہو آمن۔ من اغلق علیہ بابہ فہو آمن من دخل البیت فہو آمن۔ من وضع سلاحہ فہو آمن۔ ابوسفیان

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ اور برتاؤ دیکھکر حیرت زدہ رہ گئے ان کی بیوی ہندہ مسلمانوں کی سخت ترین دشمن تھی اس ظالم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت شفیق چچا حضرت ہمزہ رضی اللہ عنہ کا بیچ بیچ کلیجہ چباڈالا تھا، یہ خبر سنکر کہ ابوسفیان مسلمان ہو گئے ان سے خوب لڑی حتیٰ کہ ان کے اوپر تھوک بھی دیا۔ ابوسفیان کا یہ ایمان لانا مغلوبیت کی وجہ سے ہوا ہو لیکن بعد میں یہ اسلام کی حقانیت کے تہہ دل سے قائل ہو گئے۔ بہرکیف مکہ میں داخل ہوتے وقت آپ کی راہ میں کوئی مزاحم نہ ہوسکا آپ عوالی مکہ سے پورے جیش کو لیکر امن وعافیت کی ساتھ گذر گئے، لیکن سوافل کی جانب سے حضرت خالد ابن ولید کے مقابل کچھ لوگ آئے لیکن حضرت خالد نے انھیں شکستِ فاش دیدی جس وقت کہ حضرت خالد جنگ کر رہے تھے آنحضور نے قاصد بھیجا کہ خالد سے لاتقتلوا کہدو۔ قاصد گیا مگر اس کی زبان سے لاتقتلوا کے بجائے اقتلوا نکلا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار لاتقتلوا کہلایا لیکن قاصد نے ہرمرتبہ اقتلوا ہی کہا۔ البتہ چوتھی دفعہ قاصد کی زبان سے اس وقت لاتقتلوا کے الفاظ نکلے جبکہ دشمن کے ستر افراد تہہ شمشیر ہوچکے تھے۔ قاصد کہتا ہے کہ ہرمرتبہ میری زبان سبقت کرجاتی تھی میں لاتقتلوا کہنا چاہتا تھا لیکن زبان سے ازخود اقتلوا کے الفاظ نکل جاتے تھے؛ "دراصل اللہ کو" اُحد" کا بدلہ لینا منظور تھا لہذا قاصد کی زبان مشیت باری کے خلاف کیونکر کچھ کہہ سکتی تھی" اور جب کفار کے قتل کی تعداد شہدائے اُحد کے برابر پہنچ گئی اس وقت جاکر قاصد کی زبان سے لاتقتلوا نکلا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا یہی منشا تھا

کان ابن الناطور یہاں سے دوسرا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے اگلا مقولہ زہری کا ہے فرماتے ہیں کہ ابن ناطور ایلیاء کا گورنر تھا اور ہرقل کا صاحب اور اسقف نصاریٰ کا ایک دینی عہدہ تھا تو گویا یہ شام کے نصاریٰ کا دینی پیشوا تھا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ جب ہرقل اپنی نذر پوری کرنی کے لئے بیت المقدس پاپیادہ آیا تو دارالحکومت انطاکیہ سے چلکر ایلیاء میں مقیم ہوا، جب صبح یہ سو کر اٹھا تو لوگوں نے اس کا چہرہ متفکر اور غمگین دیکھا خبیث النفس سے اسی مفہوم

کو ادا کیا گیا ہے، فقال بعض بطارقتہ یعنی فوجی افسروں نے پوچھا کہ آپ کے چہرے پر حزن وملال کیسا ہے؟ قال ابن الناطور جو لوگ جنّات وغیرہ کے ذریعہ امور مستقبلہ کی خبریں دیتے ہیں وہ کاہن کہلاتے ہیں لیکن بعض لوگ علم نجوم کے ذریعہ بھی آئندہ کی کچھ باتیں معلوم کر لیتے ہیں ہرقل بھی اس فن میں کافی مہارت رکھتا تھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال علوی ستاروں کا اجتماع ہوا اور پھر ہر بیس سال پر ہوتا رہا تیسری اور آخری بار "صلح حدیبیہ" کے سال ہوا علم نجوم والوں کے یہاں اس اجتماع سے عالم میں بڑے بڑے تغیرات رونما ہوتے ہیں، ہرقل نے اس رات میں زائچہ کھینچا تھا جس سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ختنہ کرانے والے لوگوں کے بادشاہ کا غلبہ ہو گیا، انا فتحنا لک فتحا مبینا. من ہذہ الامتہ اہل عرب کے متعلق ان لوگوں کو ختنوں کا علم نہیں تھا البتہ یہود کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ ختنہ کراتے ہیں، اس لئے کہدیا صرف یہود کا یہ مذہب ہے. حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ختنوں کا حکم ہوا تھا چنانچہ یہود اور بنو اسمٰعیل اسی سنت پر قائم چلے آرہے تھے درباریوں نے کہا آپ ان سے مت گھبرائیے نصاریٰ نے انھیں پوری طرح دبا رکھا ہے. ملک غسان، غسان ایک یمنی قبیلہ ہے وادیٔ سبا کے قریب، جہاں بلقیس حکومت کرتی تھی، "سبا" ایک نہایت خوبصورت راحت افزا، اور بڑی دلکش (جنتان عن یمین وشمال) جگہ تھی وہاں ایک بند لگایا گیا تھا جسمیں بارہ کھڑکیاں تھیں ہر مہینہ ایک کھڑکی سے پانی جاری رہتا تھا اور وہ پانی بذریعہ نہر شہر میں پہنچتا تھا. نہر کے دونوں جانب بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مشورہ سے نہایت شاندار باغات لگائے تھے اللہ کی قدرت کا عجیب کرشمہ تھا کہ تمام موذی جانور سانپ بچھو اور بھڑ وغیرہ میں سے وہاں کوئی بھی نہیں پایا جاتا تھا اسی وجہ سے قرآن نے اسے "بلدة طیبة" کہا ہے لیکن وہاں کے لوگوں میں عبادت سے اعراض اور سرکشی آجانے کے بعد دیوار ٹوٹ گئی اور ایک تباہ کن سیل عام آیا جس نے قیامت مچادی جہاں آبادی تھی وہاں ویرانہ اور جہاں انگوروں اور دوسرے عمدہ پھلوں کے خوبصورت باغات تھے وہاں کیکر اور جھاڑیاں نظر آنے لگیں وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ

فدمرنا ھا تدمیرا۔ اور جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی بستی کو تباہ کردیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ لوگ اسی بستی میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، پھر وہ بستی عذاب کے حکم کی مستحق ہوجاتی ہے پھر ہم اس کو تباہ و برباد کرڈالتے ہیں" اہل "سبا" نے جب فسق و فجور شروع کردیا اور مبتلاک گناہوں میں مبتلا ہوگئے تو علماء وصلحاء نے انھیں ممکن حد تک سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ لوگ نہ مانے تو نیک لوگوں نے وہاں سے ہجرت کرنی شروع کردی انھیں یقین تھا کہ اب اس بستی پر عذاب الیم نازل ہوکر رہے گا جن لوگوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے خیال سے مدینہ میں آکر سکونت اختیار کرلی تھی اوس وخزرج انہی کی اولاد ہے، دوسری جماعت "سبا" سے شام پہنچی اور ایک عرصہ بعد عیسائی ہوگئی، غسانی وہی لوگ ہیں، ان کا سلسلۂ نسب اہل مدینہ سے تھا اس لئے ان کی وساطت سے شام وروم تک آپ کی رسالت کی اطلاع، پہنچائی گئی، غسان کا بادشاہ ہرقل کا ماتحت تھا۔ اس نے ایک آدمی کی معرفت ہرقل کو مطلع کیا کہ عرب میں ایک شخص مدعیٔ نبوت پیدا ہوا ہے اور وہ تمام عربوں پر غالب آگیا ہے۔ یہ خبر لانے والا شخص بھی عربی تھا، ہرقل نے لوگوں سے کہا کہ اس شخص کو ایک طرف لیجاکر دیکھو کہ آیا یہ ختنہ کرائے ہوئے ہے یا نہیں۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھا تو وہ ختنہ کرائے ہوئے تھا۔ ہرقل نے اس سے عربوں کی بابت دریافت کیا، اس نے بتلایا کہ ہاں عرب کے لوگ ختنہ کراتے ہیں۔ غسان کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدود شام میں ایک پانی کا نام ہے۔ الی صاحب لہ بروميه رومته الکبریٰ آجکل اٹلی کا دارالسلطنت ہے۔ اس شخص کا نام ضغاطر تھا اس نے بھی ہرقل کی رائے کی تائید کی تھی، اس کے متعلق کتب سیر میں ہے کہ اس نے نصاریٰ کو جمع کیا اور سمجھایا کہ تم لوگ ایمان لے آؤ دونوں جہاں کی فلاح صرف اسی صورت میں نصیب ہوسکتی ہے، لیکن جاہل قوم نے یہ بات برداشت نہ کی اور ضغاطر کو قتل کرڈالا۔ ہرقل اس بات سے ڈرتا تھا۔ دسکرہ درمیان میں محل تھا اور اس کے گرداگرد کمرے تھے۔ نغلّقت اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ اوپر کا کمرہ جسمیں ہرقل تھا اس کے دروازے بند کردئے گئے اور لوگ میدان میں تھے۔ جب ہرقل کو قتل

کرنے کی غرض سے لوگ جوش میں آکر دوڑے تو دروازے بند پائے دوسری توجیہ یہ ہے کہ محل سے باہر جانے کے دروازے بند پائے۔ ہرقل نے جب یہ حالت دیکھی تو کہا میں تو تمہارا امتحان لے رہا تھا کہ دیکھوں تم لوگ اپنے دین پر کسقدر مضبوطی سے جمے ہوئے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ہرقل مسلمان ہوچکا تھا یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ ہرقل مسلمان تو ہوگیا تھا۔ جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں سلطنت کے چھن جانے کے خوف سے یا زندگی کو خطرہ لاحق ہوجانے کے باعث یہ مرتد ہوگیا۔ اسی لئے اس نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کیلئے "غزوۂ موتہ" میں ایک لاکھ فوج بھیجی اور آپؐ کے بعد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں برابر مسلمانوں پر حملے کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مسلمان ہوتا تو اس قسم کے افعال کا ہرگز مرتکب نہ ہوتا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہرقل مسلمان ہوا ہی نہیں تھا، ایمان کے لئے تصدیق قلبی ضروری ہے اور یہ اسے حاصل نہیں تھی بلکہ محض معرفت حاصل تھی جس سے ایمان متحقق نہیں ہوتا۔

روایت مفصلہ کا مضمون گذر چکا اب سوال یہ ہے کہ روایت کو ترجمۃ الباب سے مناسبت کیا ہے؟ شراح نے جواب دیا کہ تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم الخ سے معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہی وحی نازل ہوئی ہے جو انبیاءِ سابقہ پر نازل ہوئی تھی، نیز ہرقل کے دس کے دس سوالات مبادئ وحی میں سے ہیں جن سے نبی کریم علیہ السلام کی عظمت مفہوم ہو رہی ہے اور ظاہر ہے کہ آپؐ کی عظمت عظمتِ وحی پر دال ہے۔ لہٰذا روایت کو ترجمۃ الباب کے معنی التزامی سے مناسبت کلی حاصل ہوگئی۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے چھ روایتیں بیان کی ہیں جن سے امام بخاری کا مقصد وحی کی عصمت وعظمت ذہن نشین کرانا ہے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہوجائے کہ آگے کتاب میں جتنی باتیں آرہی ہیں وہ سب وحی کی باتیں ہیں معصوم ومحفوظ ہیں نہایت عظیم الشان ہیں۔ اب اس سے فارغ ہوکر مصنف رحمہ اللہ کتاب الایمان شروع کر رہے ہیں۔

کتاب الایمان

ایمان امن سے ماخوذ ہے. لغۃً معنی ہیں کسی کو مطمئن کرنا لیکن عرفِ عام میں اس کے معنی تصدیق کے آتے ہیں اس لئے کہ مصدق دوسرے کو تکذیب سے مامون کر دیتا ہے، قرآن میں ہے وما انت بمؤمن لنا ای مصدق لنا. مگر شریعت نے ایمان کو تصدیقِ مخصوص کے لئے متعین کرلیا ہے اس وجہ سے شرعًا ایمان نہ یہ کہ مطلق تصدیق کا نام ہے بلکہ تصدیق الرسول فیما جاء به عن ربہ" کو کہتے ہیں. ان تمام اشیاء کی تصدیق کرنا جنکو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب باری سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے لیکر آئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مسائل اجتہادیہ داخلِ ایمان نہیں ہیں. مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایمانِ شرعی کی حقیقت ذکر کریں گے. اس کے اندر اہلِ قبلہ کے جو مشہور اقوال ہیں وہ سنئے!

(۱) محققین اور اکثر ائمہ کہتے ہیں الایمان تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی کل ما علم مجیہہ بہ بالضرورۃ تصدیقًا جازمًا، ان کے یہاں مجرد تصدیق ایمان ہے عمل جوارح اس میں معتبر نہیں (۲) شوافع حنابلہ، مالکیہ، محدثین معتزلہ اور خوارج کے نزدیک ایمان تصدیق بالقلب اقرار باللسان اور عمل بالارکان کا نام ہے، تو پہلے قول کے مطابق ایمان بسیط ہوا اور قولِ ثانی کے اعتبار سے، مرکب (۳) تیسرا قول امام ابوحنیفہ، بعض المتکلمین اور عام فقہاء کا ہے کہ ایمان اقرار باللسان اور معرفت قلب کا نام ہے شیخ ابوالحسن اشعری شیخ ابومنصور ماتریدی اور امام نسفی کا میلانِ خاطر بھی اسی طرف ہے (۴) چوتھا قول مرجیہ وکرامیہ کا ہے یہ صرف نطق کے قائل ہیں پانچواں قول جہمیہ کا ہے ان کے یہاں ایمان فقط معرفتِ قلبیہ کا نام ہے. ان مختلف اقوال میں دوسرا قول یعنی ایمان مجموعہ امور ثلثہ کا نام ہے، اس قول کے ماننے والوں میں باہمی اختلاف ہوتا ہے شوافع اور محدثین اقرار اور عمل کو ایمان کے اجزائے مقومہ نہیں مانتے بلکہ مکملہ مانتے ہیں. اور

خوارج و معتزلہ کے نزدیک یہ اجزائے مقومہ ہیں اور اجزائے مقومہ کے انتفاء سے انتفاءِ کل ہوجاتا ہے اس لئے علیٰ قول المعتزلہ والخوارج انتفاءِ عمل انتفاءِ ایمان کو مستلزم ہوگا۔ اور محدثین کے یہاں یہ اجزائے مکملہ ہیں اور اجزائے مکملہ کے انتفاء سے شئے فنا نہیں ہوتی جیسے ہاتھ پیر کے کٹ جانے سے زندگی ختم نہیں ہوجاتی یا پھول پھل اور پتے جھڑ جانے سے یہ نہیں کہا جاتا کہ درخت ختم ہوگیا۔ اب اگر کوئی شخص مقر باللسان اور عامل بالارکان نہیں ہے تو وہ معتزلہ و خوارج کے مقطۂ نظر سے ایمان کی حدود سے نکل جائے گا۔ البتہ کفر میں داخل ہوگا۔ یا نہیں؟ اس میں دونوں گروہ مختلف ہو گئے! خوارج کہتے ہیں ایسا شخص بالکل کافر ہوجائیگا۔ لیکن معتزلہ اس کے قائل نہیں بلکہ ان کے نزدیک ایسے لوگوں کے لئے کفر و اسلام کے بین بین ایک منزلہ ہے یہ وہاں رہیں گے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ ترک عمل اور اقرار باللسان کے نہ پائے جانے سے آدمی مومن ہی رہے گا۔ نفی صرف تکمیل و تزیین کی ہوگی ۔ ایمان کی دو شاخیں ہیں ایک نفس ایمان جو محض تصدیق ہے جیسا کہ متکلمین نے کہا۔ اور دوسری شاخ ایمان کامل ہے۔ اس کے اندر عمل و اقرار بھی داخل ہیں۔ اس بنا پر کہا جائے گا کہ متکلمین و محدثین کا اختلاف محض لفظی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ محدث جب لفظ ایمان بولیگا۔ تو اس سے مراد ایمانِ کامل لیگا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی اصطلاح ہے۔ اور متکلم جب لفظِ ایمان بولتا ہے تو اس سے نفس ایمان مراد لیتا ہے۔ اس لئے اگر تعریف میں فرق پڑگیا تو اس سے کوئی حرج لازم نہیں آتا حقیقت میں یہ نزاعِ لفظی ہے۔ ہاں خوارج و معتزلہ سے متکلمین کا نزاع نزاعِ حقیقی ہے کیونکہ یہ لوگ اقرار و عمل کو ایمان کے اجزاء مقومہ مانتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ عند المعتزلہ کون کون سے اعمال داخل ایمان ہیں۔ تو دراصل انکی دو جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت تو محض فرائض کو اور دوسری جماعت مطلقاً اعمال کو اجزائے مقومہ مانکر داخل فی الایمان کی قائل ہے۔ چوتھا مذہب مرجیہ کا ہے وہ کہتے ہیں لایفر للایمان شئی عن العمل ولاینفعہ فالمرجیہ فی لبساطتہ مع المتکلمین ولذا قالت المرجئۃ والمتکلمون ان الایمان لایزید ولاینقص

لِاَنَّ الزیادۃ والنقصان مبنی علیٰ ترکیبہ واذا کان الایمان حقیقۃ لبسیطۃ فلا یخل فی نفس الایمان ترک العمل او عدم الاقرار وان کان یضرفی کمال الایمان عند المتکلمین واما المحدثون نقائلون بزیادتہ ونقصانہ ولکن مراد المحدثین بزیادۃ الایمان، الایمان الکامل وانتقاصہ کذالک۔ وعند المعتزلہ والخوارج المراد بزیادتہ وبنقصانہ، زیادۃ نفس الایمان وانتقاصہ کذالک۔

متکلمین حنفیہ اور اشاعرہ، ماتریدیہ نے اجرائے۔ احکام کیلئے اقرار باللسان کو شرط قرار دیا ہے اسلام کے جو ظاہری احکام ہیں وہ بغیر اقرار کے جاری نہیں کئے جائینگے، اگرچہ آخرت کے اعتبار سے نجات ممکن ہو۔ علامہ تفتزانی کہتے ہیں کہ اقرار مسلمانوں کے امیر کے سامنے ہونا چاہئے تاکہ اجرائے احکام کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ بہر حال مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایمان کے اس معنی کو ذکر کریں گے جسکے اندر ایمان کو مجموعۂ ثلثہ بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام موصوف کے یہاں اقرار وعمل اجزائے مکملہ وتزیینیہ ہیں، مقومہ نہیں۔ نصوصِ شرعیہ میں جب لفظِ ایمان آئے گا۔ تو شوافع اور محدثین ایمانِ کامل مراد لیں گے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ لفظِ ایمان کبھی ایمان کامل کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور کبھی نفسِ ایمان کے لئے ثانی معنی حقیقتِ شرعیہ ہیں اور معنی اول مجاز شرعی، اسلام کی حقیقت انقیاد ہے۔ انقیاد کی دو قسمیں ہیں، انقیادِ ظاہری، انقیادِ باطنی، انقیاد ظاہری قول وعمل سے متعلق ہوتا ہے اور انقیادِ باطنی قلب سے انقیاد ہمیشہ اذعان قلبی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لئے مصداق کے اعتبار سے ایمان واسلام دونوں متلازم ہیں، ہاں مفہوم کے لحاظ سے ان میں فرق پڑ جاتا ہے، اب ہمارے پیش نظر تین لفظ ہیں، ایمان اسلام، دین۔ محدثین تینوں کو مرادف مانتے ہیں کیونکہ ایمان ان کے یہاں ایمان کامل ہوتا ہے لہذا اعمال وغیرہ بھی آگئے اس وجہ سے تینوں متحد ہیں۔ متکلمین حقیقتِ شرعیہ کا خیال کرتے ہیں اس لئے وہ تینوں کو متباین مانتے ہیں، حدیث جبرئیل میں مفاہیم اور حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے وہاں ایمان واسلام میں فرق پیدا ہو گیا۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے ایمان قول وفعل کا نام ہے اور وہ بڑھتا اور گھٹتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لیزدادوا ایمانا مع ایمانہم وزدناہم ہدیٰ۔ ویزید اللہ الذین اہتدوا ہدیٰ۔ والذین اہتدوا زادہم ہدیٌ۔ واٰتٰہم تقوٰہم۔ ویزداد الذین اٰمنوا ایمانا۔ وقولہ عزوجل ایکم زادتہ ہذہٖ ایمانا فاما الذین اٰمنوا فزادتہم ایمانا وقولہ فاخشوہم فزادہم ایمانا۔ وقولہ وما زادہم الا ایمانا وتسلیما۔ والحب فی اللہ و البغض فی اللہ من الایمان۔ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرنا اور بغض رکھنا ایمان سے ہے عمر ابن عبدالعزیز نے عدی ابن عدی کو لکھا کہ ایمان کے فرائض، شرائع، حدود اور سنن ہیں پس جس شخص نے انھیں کامل کیا اس نے ایمان کو کامل کیا اور جس نے انھیں کامل نہ کیا اس نے ایمان کو کامل نہ کیا۔ اگر میں زندہ رہا تو انھیں بیان کرونگا تاکہ تم لوگ ان پر عمل کرو اور اگر میں مرگیا تو میں تمہاری صحبت کا حریص نہیں ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ولکن لیطمئن قلبی۔ معاذ نے (اسود ابن ہلال سے) کہا کہ ہمارے پاس کچھ دیر بیٹھ تاکہ نصیحت پکڑیں۔ ابن مسعودؓ نے کہا کہ یقین سب کا سب ایمان ہے، اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ کوئی آدمی حقیقتِ ایمانی کو نہیں پہنچتا تاکہ اس چیز کو چھوڑ دے جو سینے میں متردد ہوتی ہے:۔

یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے کہ کتاب الایمان میں اسلام سے متعلق مباحث ذکر کرنے کا کیا مطلب؟ جواب یہ ہے، چونکہ محدثین کے نزدیک ایمان واسلام متحد ہیں اس لئے اگر کتاب الایمان میں مباحث متعلقہ بالاسلام بیان کردئے گئے قطعاً محلِ اشکال نہیں مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بنی الاسلام علی خمس کے معنی بنی الایمان ہی کے ہیں۔ وہو قول وفعل یہ دوسرا ترجمہ ہے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ قول ہے اور عمل فعل ہے جو اسلام نے واجب قرار دیا ہے۔ وہو یزید وینقص۔ چونکہ مجموعہ قول وفعل کا نام ہے اس لئے اس

میں کمی زیادتی بھی ہوتی ہے۔ آگے مصنف رح چند آیات پیش فرما رہے ہیں جو ان ترجمہ سے پوری مناسبت رکھتی ہیں۔ مصنف عموماً ایک باب میں مختلف تراجم رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں مناسبت ضروری ہوتی ہے جیسے ترجمۂ اولیٰ میں اساس امور خمسہ کو بتلایا گیا ہے۔ ترجمۂ ثانیہ معلول ہے ترجمۂ اولیٰ کا اور ترجمۂ ثالثہ معلول ہے ترجمۂ ثانیہ کا کیونکہ ان اجزا ہی کی وجہ سے تو زیادتی ونقص مانتے ہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بساطتِ ایمان کے قائل ہیں، فرماتے ہیں، الایمان لایزید ولاینقص۔ اور اسی لئے آپ کا ارشاد ہے ایمانی کا یمان جبرئیل علیہ السلام،، بعض حضرات نے کہا ہے کہ بخاریؒ امام اعظم رحمہ اللہ کی تردید کر رہے ہیں۔ مگر ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ امام اعظم اور محدثین کے درمیان نزاع لفظی ہے اور امام بخاریؒ کی شان سے قطعاً بعید ہے کہ وہ نزاعِ لفظی کی وجہ سے اس قدر محنت کریں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مصنفؒ کا مقصد مرجیہ وکرامیہ کی تردید کرنا ہے۔ اس وجہ سے کہ ان لوگوں کے نزدیک عمل کی کوئی اہمیت نہیں جس کی وجہ سے اسلام کو ناقابل بیان نقصان پہنچا ہے۔ بعض آیات میں نسبت زیادتی خود ایمان کی طرف ہے اور بعض میں ہدیٰ کی طرف، اور ہدایت بھی ایمان کامل ہی ہے اس لئے، نقص کا ثبوت بھی ہوگیا اور تمام نصوص سے ترکیبِ ایمان اور جزویتِ اعمال بھی ثابت ہوگئی

ولکن لیطمئن قلبی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا رب ارنی کیف تحی الموتیٰ قال اولم تؤمن قال بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی کیف بعض اوقات انکار کیلئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً زید خالد سے کہتا ہے تجھے بہت ماروں گا۔ خالد جواب دیتا ہے ذرا مار تو سہی دیکھیں کیسے مارتا ہے، دیکھئے یہاں سوالِ کیفیت مرادفِ انکار ہے۔ تو رَبِّ ارنی کیف تحی الموتیٰ،، میں سوال کیفیت سے تھا اس لئے شبہ ہوسکتا تھا کہ ممکن ہے ابراہیم علیہ السلام کو صفتِ احیا پر یقین نہ ہو۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو ابراہیم علیہ السلام کا مقصد مکمل طور پر معلوم تھا مگر چونکہ یہ شبہ کا مقام تھا، لوگ غلط مفہوم لے سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ میرے برگزیدہ بندے ایک منٹ بھی ایسی جگہ پر رہیں، اس لئے فرمایا گیا اَوَلَم تؤمن؟ قال بلیٰ یعنی ایمان تو میں رکھتا ہوں۔ محض اطمینانِ قلب کی غرض سے

احیائے موتٰی کی رویت چاہتا ہوں۔

دراصل یقین کے تین مرتبے ہیں علم الیقین عین الیقین حق الیقین اگر جانب مخالف کا احتمال باقی نہ رہے تو یقین کہلاتا ہے علمائے کلام کے یہاں علم نام ہے ایسی تمیز کا جس میں احتمالِ نقیض باقی نہ رہے لا بالفعل ولا بالاحتمال مثلاً کہ یقین ہوتا ہے مگر چونکہ ہر وقت زایل ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے اس کو مطمئن نہیں کہینگے بلکہ کہا جائے گا کہ اسے علم الیقین حاصل ہے۔ اور اگر اسکا مشاہدہ ہو گیا تو ظاہر ہے کہ یقین میں پہلے کی نسبت اور اضافہ ہو گیا اب اس یقین کو عین الیقین سے تعبیر کریں گے۔ ابن عباس سے روایت ہے کہتے ہیں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس الخبر کالمعاینۃ ان اللہ تعالیٰ خبر موسیٰ بما صنع قومہ فی العجل فلم یلقی الالواح فلما عاین ما صنعوا القی الالواح اور اگر مشاہدۃ العلوم فی النفس ہو مثلاً اپنی انگلی آگ میں جل گئی تو اس صورت میں جو یقین حاصل ہوگا اس کو حق الیقین کہیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم الیقین حاصل تھا اور اسی پر ایمان کا مدار ہے البتہ آپ عین الیقین کے بلند مقام پر پہنچنا چاہتے تھے چنانچہ انکی خواہش کے مطابق احیائے موتٰی کا مشاہدہ کرایا گیا۔ اسی وجہ سے متکلمین کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی و زیادتی کیفاً تو ممکن ہے۔ جیسے کہ یقین کے درجات کے تفاوت سے معلوم ہوتا ہے، لیکن کمّاً نہیں۔ قال معاذ اجلس بنا نومن ساعۃ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پہلے ہی سے مومن ہیں۔ پھر نومن ساعۃ کے کیا معنی؟ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ایمان میں زیادتی ہوگی بایں طور کہ وہ بیٹھیں گے تو آخرت وغیرہ کا ذکر ہوگا اور اس سے ایمان میں زیادتی ہوگی، تقویت بہم پہنچیگی۔ دوسری توجیہ امام نووی نے یہ کی ہے کہ اس کا مطلب تجدید ایمان ہے حضرت معاذ کی مخاطب اسود ابن ہلال ہیں، تو نومن ساعۃ کا خلاصہ اور مطلب یہ ہوا کہ نذکر اللہ فنزداد ایماناً او نجدد الایمان۔ علی الثانی یثبت عدد امور الخیر فی الایمان۔ وعلی الاول یثبت الترجمۃ الثالثۃ۔ قال ابن مسعود الیقین الایمان کلہ۔ تاکید بلفظ الکل سے معلوم ہوا کہ ایمان متصف بالکل والجزء ہے اسی لئے زیادۃ ونقصان کو قبول کرتا ہے۔ وقال مجاہد قرآن میں ہے شرع لکم من الدین الخ تمام انبیائے

کرام کو ایک ہی دین عطا کیا گیا ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ، تو معلوم ہوا کہ دین سب کا ایک ہی ہے سب ایک ہی ملت کے مبلغ، ایک ہی تحریک کے داعی اور ایک ہی اصول کے ماننے والے ہیں، ہاں فروعات میں بتقاضۂ مصلحتِ زمانہ تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے، تو دین کی وحدانیت کا علم آیتِ مذکورہ سے ہوا دوسری جگہ ارشاد ہے لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجا. کل افرادی ہے اس لئے مراد ہے لکل واحدٍ واحدٍ من الانبیاء. شرعۃ سنت کو اور منہاج طریق کو کہتے ہیں۔ اس آیت سے دریافت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں مختلف ہیں۔ ان دونوں آیتوں کو پیشِ نظر رکھکر مصنف رحمۃ اللہ علیہ بتانا چاہتے ہیں کہ شرائع کے اندر اختلاف اور فرق ہے، اور فروعات کی کمی وزیادتی مستلزم ہے ایمان کی کمی وزیادتی کو محدثین کے نزدیک کیونکہ ایمان سے مراد ایمان کامل ہے اس وجہ سے یہ حضرات دین وشریعت اور ایمان کے اندر اتحاد کے قائل ہیں، جیسے کہ تفصیل گذر چکی دعاؤکم ایمانکم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے دعاؤکم کی تفسیر ایمانکم سے کی ہے۔ دعا فعل ہے اس لئے معلوم ہو گیا کہ ایمان کے اندر فعل داخل ہے اس سے مرجیہ وکرامیہ کے قول (اعمال کو ایمان میں کوئی دخل نہیں) کی صاف تردید ہو جاتی ہے، حدثنا عبید اللہ ایمان کو مکان سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح مکان بہت سی تکلیفوں سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح ایمان انسان کو بے شمار مضرت رساں چیزوں سے مامون رکھتا ہے لہذا یہ تشبیہ علیٰ سبیل الاستعارہ بالکنایہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مشبہ بہ محذوف ہے اور اس کے لوازم یعنی دعاؤکم کا اثبات مشبہ کے لئے کیا گیا ہے، اب عبارت کے معنی یہ ہوں گے بنی الاسلام الذی کالبیت فی الحفظ عن الانصار علیٰ خمس ودعاؤکم واثبات البناء للاسلام ترشیح. ہر مکان کے اندر دیواروں اور ستونوں کا ہونا ضروری ہے پھر پورے مکان کا مدار اس کی اساس پر ہوتا ہے بالکل اسیطرح شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ کو ایمان کی اساس کہا جائے گا جسکے موجود نہ ہونے سے ایمان کا معدوم ہونا لازم آتا ہے، اور باقی امور اربعہ کو (جو کہ فعلی ہیں) مکان کی دوسری چیزیں دیواریں اور چھتیں وغیرہ مانا جائے گا بہرحال اس سے ایمان کا کم وزیادہ ہونا

معلوم ہوگیا الایمان قول وفعل یزید وینقص۔

باب امور الایمان الخ حدثنا...... ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایمان کی چند اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیاء یعنی بری باتوں سے شرم کرنا ایمان کی بڑی شاخ ہے ✻

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب امور الایمان کو قرار دیا ہے۔ اضافتِ امور الایمان بیانیہ بھی ہوسکتی ہے یعنی باب امور التی ہی للایمان اور یہ بھی ممکن ہے کہ اضافت تخصیص کے لئے ہو معنی یہ ہوں گے الامور المعتبرۃ للایمان۔ احتمال اول میں دونوں (امور۔ ایمان) ایک ہیں وقول اللہ یہ اگر مجرور ہے تو باب کا مضاف الیہ ہے اور اگر مرفوع ہے تو اس کی خبر فیہ محذوف ہے۔ اس صورت میں ترجمۃ الباب کے لئے دلیل ہوگا۔ اور اس کو مجرور پڑھنے کی شکل میں باب میں دو ترجمے مانے جائینگے۔ جناب حق تعالیٰ نے لیس البران تولوا الخ آیت کے اندر من اٰمن سے عقاید کو بتلایا ہے اور آتی المال سے عبادت مالیہ کو ذکر کیا ہے واقام الصلوٰۃ کے ذریعہ عبادتِ بدنیہ کا تذکرہ کیا ہے، والصابرین فی الباساء میں جہاد ہے اور ایفائے عہد سے حقوق العباد کیطرف اشارہ مقصود ہے۔ یہ سب امور ایمانی آیتِ مذکورہ میں موجود ہیں علیٰ حبہ کی قید اعطاءِ مال کے ساتھ لگائی گئی اس لئے کہ کمال اسی مال کے دینے میں ہے جو اپنے نزدیک محبوب ترین ہو۔ اور اس کو استعمال کرنیکی قدرت پوری طرح ہو۔ کمال ایثار اسی صورت میں ہے ورنہ مرتے وقت دیدینا یا ردی مال بخشدینا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔

ایمان گویا ایک درخت ہے اور اس کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور بعض روایات کے اعتبار سے چند اوپر ستر شاخیں ہیں بہرحال یہاں سب کا تذکرہ نہیں صرف ایک شاخ یعنی "حیاء" کا تذکرہ ہے۔ الحیاء خیر کلہ، فرمایا گیا ہے ـــــ حیاء کبھی مذموم بھی ہوتی ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء فی العلم سے روکا ہے۔ بضع اس کا اطلاق دو سے دس تک یا ایک سے دس تک یا تین سے دس تک ہوتا ہے۔ باب المسلم من سلم المسلمون الخ حدثنا.... ابن عمر سے

مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر کامل وہ ہے جس نے ما نہی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا ﴿

مومن کامل وہی ہے جو کسی کو دیدہ و دانستہ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچائے، مسلمان کو اذیت دینا، اسے کسی بھی طرح سے پریشان کرنا، مومن کی شان کے قطعی خلاف ہے من لسانہ اس سے مطلب طعن و تشنیع یا برا بھلا کہنا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے زبان کا زخم نہیں بھرتا.

جراحات السنان لہا التیام   ولایلتام ماجرح اللسان!

اس لئے کسی مسلمان کو ایسی بات نہ کہنی چاہیئے جس سے اُسے اذیت محسوس ہو، ویدہ سے مراد ہے کہ مسلمان سے جنگ نہ کی جائے کیونکہ ایک مومن کے لئے کسطرح یہ جائز نہیں کہ وہ کسی مومن پر ہاتھ اٹھائے یہ کام کفار و مشرکین کا ہے۔ اس روایت میں دونوں چیزوں سے روکا گیا ہے اس کے بعد فرمایا المہاجر من ہجر مانہی اللہ عنہ، مہاجر کامل وہی ہے جو اُن تمام باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ جل مجدہٗ اور رسول اللہ نے اجتناب کا حکم فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت صرف مکانی ہی نہیں ہوتی بلکہ منہیات سے باز رہنا اور ان کو ترک کرنا بھی ہجرت میں داخل ہے واللہ اعلم بالصواب باب ای الاسلام افضل لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ای الاسلام افضل؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ" ای کی اضافت امور متعددہ کی طرف ہوتی ہے حالانکہ اسلام حقیقت واحدہ ہے، بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے عبارت ہے ای خصائل الاسلام افضل۔ اور بعضوں کی رائے ہے کہ مراد ای افراد الاسلام افضل ہے جواب اولی پر مراد خصلتہ من سلم الخ اور دوسری توجیہ پر المسلم الذی سلم مطلب ہوگا یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ بہت سے کافر بھی اس صفت سے متصف ہوتے ہیں بلکہ جینی تو معمولی سے کیڑے کو بھی تکلیف پہنچانا گناہ عظیم سمجھتے ہیں انسان تو بڑی چیز ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جوتا تک نہیں پہنتے، منہ پر کپڑا باندھے رکھتے ہیں تاکہ کوئی جاندار جوتے سے دبکر یا منہ میں آکر مر نہ جائے۔ بایں وجہ

روایت کے بیان کردہ مسئلہ کے بموجب بہت سے کافروں کو بھی مسلمان ہونا چاہیے درانحالیکہ یہ بات صحیح نہیں جواب یہ ہے کہ قاعدہ عربیہ کے اعتبار سے موصوف بالصفت پر اگر کوئی حکم کیا جائے تو وہ صفت اس کی علت ہوتی ہے یہاں پر من سلم المسلمون" کے اندر صفت اسلام ہے معلوم ہوا کہ مسلمان وہ ہے جو مسلمان کو اس کے اسلام کی وجہ سے ایذا رسانی سے محفوظ و مامون رکھے اور کافر مسلمان کے اسلام کو حفاظت کی علت قرار نہیں دیتا اس وجہ سے شبہ درست نہیں۔ باب اطعام الطعم من الاسلام حدثنا۔۔۔ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

سوال کیا ایّ الاسلام خیر؟ فرمایا یہ کہ تو لوگوں کو کھانا کھلائے اور واقف و ناواقف

لوگوں کو سلام کرے ؛

تطعم الطعام میں اَن مصدریہ محذوف مانا جائے گا اور مراد یہ ہوگی کہ خصلۃ ان تطعم الخ جیسے تسمع بالمعیدی، میں مراد اں تسمع ہے۔ یہاں پر دو طریقے ذکر کئے گئے ہیں انفاقِ مال، انفاقِ کلام اطعام انفاقِ مال ہے اور سلام انفاقِ کلام۔ تقرأ السلام کے اندر السلام علیکم کہنا یا خط وغیرہ کی ذریعہ سلام پہنچانا بھی داخل ہے، علیٰ من عرفت و من لم تعرف ای لاتخص بہ احداً تکبراً و تصنعاً بل تعظیماً لشعار الاسلام ومراعات لاخوۃ المسلم۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں لفظ مَن عام ہے جس کی وجہ سے کافر و گمراہ لوگ بھی اس میں داخل ہو گئے چاہیئے کہ انھیں بھی سلام کیا جائے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ حدیث کا مصداق صرف مسلمان ہی ہیں کیوں؟ اس وجہ سے کہ سلام ایک دعا رحمت ہے اور دعا و رحمت کے مستحق کافر و مشرک اللہ کے باغی کسیطرح نہیں ہو سکتے قرآن کہتا ہے اولٰئک جزاءھم اَنَّ علیھم لعنت اللہ والملائکۃ والناس اجمعین۔

باب عن الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ حدثنا۔۔۔ حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ آپ نے

فرمایا تمہارے میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوگا تا وقتیکہ اپنے بھائی کیلئے بھی وہی

چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے ؛

اس جگہ بھی کمال ایمان مراد ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ایمان و اسلام سے متعلق دوسری

روایات میں اس کا ذکر نہیں ہے اس لئے ایمانِ کامل ہی مراد لینا پڑے گا۔ یحب لاخیہ اخوت سے عبارت اخوت دینی ہے اب ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر واقعۃً یہ کمال کی بات ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے قول رب ھب لی ملکا لا ینبغی لاحدٍ من بعدی انک انت الوھاب،، کا کیا مطلب ہوگا؟ اسی طرح وجعلنا للمتقین اماما میں بھی "یحب لاخیہ" کی مخالفت پائی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہم دعا کرتے ہیں آتِ محمدن الفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ۔ الخ مقام محمود ہم صرف حضور کے لئے مانگتے ہیں اور اس کی صلاحیت ایک ہی آدمی کے لئے ہو سکتی ہے، حضور کا ارشاد ہے ہمارے لئے مقام محمود طلب کرو،، اس صورت میں بھی روایتِ مذکورہ کی مخالفت موجود ہے۔ والجواب علیٰ نوعین الاول ان الجملۃ کفایۃ عن ترکِ الحسد والبغض ولایرادظاہرہ ان الانسان مجبول علیٰ عدم ایثار احد علیٰ نفسہ فی بعض الامور۔ والثانی ان الکلام مخصوص فیما یمکن فیہ الاشتراک۔ والثالث ان الروایۃ محمولۃ علی الاکثر لا علی الاستغراق فلایرد علیہ ما اوردا قولا۔ باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان حدثنا ۔۔۔۔ ابوہریرۃ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تمہارے میں سے کوئی مومن نہ ہوگا حتیٰ کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور بیٹے سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں ؛

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے دو روایتیں ذکر کی ہیں ایک حضرت ابوہریرہؓ کی اور دوسری حضرت انس کی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ تمہارے میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا یہانتک میں تمہاری اصل و فروع سے زیادہ تمہارے نزدیک محبوب نہ ہو جاؤں،، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ناس کا لفظ بھی مذکور ہے اس لئے معلوم ہوا کہ اپنا نفس بھی اس میں داخل ہے۔ واضح رہے کہ یہاں بھی لایومن سے ایمان کامل ہی مراد ہے ورنہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ مذاکرہ کے وقت ایمان کی تعریف کے بیان میں اس کو

بھی ذکر کیا جانا چاہیئے تھا بخاری کی روایت میں آگے آئیگا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا انت احب الی یا رسول اللہ من کل شئی الا من نفسی،، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ومن نفسک یا عمر لا تؤمن حتیٰ اکون احب الیک من نفسک. یہ سنکر حضرت عمر قدرے توقف سے بولے یا رسول اللہ انت احب الی من کل شئی ومن نفسی آپ نے فرمایا تم ایمانک یا عمر. اسی طرح اگلی روایت میں مما سواہما کے الفاظ ہیں. اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہونا چاہیئے، خود اپنے نفس سے بھی. یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ محبت ایک غیر اختیاری چیز ہے، انسان باوجودیکہ ایک امر کو مکروہ سمجھتا ہے لیکن پھر بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے حتیٰ کے محبوب کو حاصل کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیتا ہے. اور یہ کوئی انسان ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دوسری چیزوں میں بھی یہ جذبہ پایا جاتا ہے جسکی زندہ مثال شمع و پروانہ میں گل و بلبل میں اور چاند چکور وغیرہ میں پائی جاتی ہے. مقصد یہ ہے کہ محبت ایک غیر اختیاری امر ہے اس کے ساتھ تکلیف کیسے جائز ہو گی؟ جواب یہ ہے کہ محبت ایک تو طبعی ہے جیسے بلا شبہ غیر اختیاری کہہ سکتے ہیں لیکن ایک محبت عقلی اور اختیاری ہوتی ہے وہی دراصل اسجگہ مراد ہے اور وہ نام ہے اختیار ما فیہ النفع کا یعنی اشیائے نافعہ کی طرف بڑھنا اور نقصان دہ چیزوں سے بچنا. کڑوی دوا سے آدمی کو طبعی طور پر نفرت ہوتی ہے لیکن تاہم مریض اس کی شرب کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ وہ نافع ہے، کونین کی ٹکیہ کسقدر زیادہ کڑوی ہے مگر بخار میں عقلاً اس کی طرف میلان پایا جاتا ہے صرف اس وجہ سے کہ اس میں فائدہ ہے. جب ہم معمولی معمولی فائدے کی چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں تو محبت عقلی کا زبردست تقاضا ہے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو تمام دنیا کی اتباع پر مقدم رکھیں. اس وجہ سے کہ آپ کی اتباع میں نہ صرف یہ کہ دنیاوی ہی فائدہ ہے بلکہ اخروی فائدہ بھی ہے. جو اصل مقصد ہے لہذا جب یہاں محبت سے مراد محبت عقلی ہوئی (نہ کہ طبعی) تو تکلیف مالا یطاق کہاں لازم آئی؟ بعض حضرات نے کہا ہے کہ محبت سے مراد محبت ایمانی ہے. جناب رسول اللہ کی وقعت

وعظمت یوں تو سب پر عیاں ہے ہی لیکن جوش ایمانی ایک مخصوص عظمت کا متقاضی ہے یعنی قلب کی گہرائی میں ایمان کا ایک ایسا داعیہ پیدا ہو جائے جو ہر حالت کے اندر آپؐ کی اتباع پر ابھارے خواہ تختہ دار ہی سامنے کیوں نہ ہو۔ اور آپؐ کی نافرمانی ایسی تلخ گھونٹ بن جائے جو کسی طرح حلق سے نیچے اتارے نہ اترے۔ آپؐ کا ارشاد ہے محبت نام ہے۔ اسبات کا کہ تمہاری اپنی خواہشات میری خواہشات کے تابع ہو جائیں،، محققین کہتے ہیں کہ یہاں محبت طبعی بھی مراد لی جاسکتی ہے لیکن محبت طبعی کے لئے علم بالمحبوب بھی ہونا ضروری ہے پروانہ اپنی محبوب (شمع) پر ہر وقت قربان ہونے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ وہ سامنے ہو، درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ محبت طبعی کے چار اسباب ہیں کمال جمال احسان قرب۔ کمال خواہ خلق میں ہو یا کسی اور چیز میں مطلقا کمال، باعث محبت ہے۔ دوسرا سبب جمال ہے جسپر ظاہر ہے کہ ہر شخص دل وجان سے نچھاور ہوتا ہے۔ تیسرا سبب احسان ہے الانسان عبد الاحسان۔ اگر جانور پر بھی احسان کیا جائے تو وہ بھی اپنے محسن سے محبت کرنے لگتا ہے چوتھا سبب قرب ہے خواہ جسمانی ہو خواہ روحانی اسی کی وجہ سے آدمی دور دور سے کھچکر آتے ہیں باپ بیٹے سے بھائی بھائی سے اور ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار سے قرب ہی کے باعث الفت کرتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع اوصاف اربعہ مذکورہ ہیں ان چیزوں میں سے اگر کسی میں ایک بھی چیز پیدا ہو جائے تو لوگوں کو اس سے محبت طبعی ہو جاتی ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تو چاروں اوصاف مجتمع ہیں

حسن یوسف، دم عیسیٰ ید بیضا داری
آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپؐ کے اندر جمال روحانی بھی تھا اور جسمانی بھی، حضرت علی فرماتے ہیں ناعتہ لم ارا احدًا قبلہ ولا بعدہ،، برار ابن عازب کہتے ہیں کہ حضور جب چاندنی راتوں میں ظاہر ہوئے در انحالیکہ آپؐ کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور آپؐ حلۂ حمرا پہنے ہوئے تھے میں حیران تھا

کبھی بدر کو دیکھتا تھا اور کبھی آپ کو اور موازنہ کر رہا تھا کہ کون حسین ہے،، آخر میں فیصلہ کرتے ہیں کہ ہوا جل فی عینی من البدر،، ایک صحابی سے پوچھا گیا اکان وجہہ مثل السیف؟ قال لا بل مثل البدر،، سیف کے اندر حسن کی صرف ایک صفت ہوتی ہے یعنی اس کا چمکدار ہونا اور اسکا لمبا ہونا یہ صفت قبیح ہے اور بدر میں حسن کی دو صفتیں ہیں یعنی اس کا روشن ہونا بھی اور گول ہونا بھی اس وجہ سے بل مثل البدر کہا گیا۔ ملا علی قاری نے شرح شفا میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رات کے وقت مجھے سوئی میں دھاگہ ڈالنا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کے سامنے سوئی لیجا کر دھاگہ ڈال لیتی تھی،، یہ تھا آپ کا جسمانی جمال اور روحانی جمال تو آپ کا اکمل ترین تھا ہی۔ اجتماعی و انفرادی حیثیت سے آپ کے اخلاق نہایت بلند اور ارفع تھے قرآن میں فرمایا گیا انک لعلی خلق عظیم،، یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کا تو شہرہ ہے کہ وہ جس کوچے سے گذرتے تھے قیامتیں برپا ہو جاتی تھیں، عورتیں وفورِ عشق میں اپنے ہاتھ کاٹ لیتی تھیں کپڑے نوچ ڈالتی تھیں لیکن آپ کے بارے میں اس قسم کی باتیں کہیں سننے میں نہیں آئیں؟ جواب دیکھئے کہ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ ایک زبردست اور ہمہ گیر مہم سر کرنی تھی، بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ راست پر لانا تھا اس وجہ سے جناب باری تعالیٰ نے لوگوں کی توجہات کو اس طرف مرکوز ہونے سے باز رکھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یقیناً آپ کو اپنے مشن کے کامیاب بنانے میں نہ جانے اور بھی کتنی شدید رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ آپ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ آپ زیادہ حسین ہیں یا یوسف علیہ السلام زیادہ حسین تھے؟ آپ نے فرمایا اخی یوسف اصبح وانا املح،، اور ظاہر ہے کہ ملاحت صباحت پر راجح ہے۔ صباحت میں پھیکا پن ہوتا ہے اور ملاحت میں کشش و جاذبیت۔ محبت کا ایک سبب کمال تھا اور کمال میں سب سے بڑا کمال، کمال علمی ہے فرمایا گیا علمت علوم الاولین والآخرین ایک سبب احسان تھا سو تمام انسانوں پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت عظیم

احسانات ہیں اہلِ تصوف نے تو یہانتک کہدیا ہے کہ تقسیم وجود اور افاضۂ وجود بھی مخلوقات پر بواسطہ حقیقتِ محمدیہ کے ہے جس طرح قمر آفتاب سے نور لیتا ہے اور کائنات کو منور کرتا ہے ٹھیک اسیطرح آپ واسطہ فی العروض ہیں افاضۂ وجود علی الانسان کے لئے۔ آپؐ نے فرمایا انما انا قاسم واللہ یعطی،، اگرچہ آپؐ اس وقت عالم سے غائب ہیں لیکن افادۂ کمالات آپؐ ہی کے واسطے سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے عہد لیا گیا تھا۔ آپؐ کی نبوت کا کیونکہ خود انبیاء کرام کو جو فیض حاصل ہوتا تھا اس میں واسطہ آپؐ ہی رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم فرمایا گیا ہے۔ اس لئے کہ آپؐ درجہ میں علت کے ہیں اور علت خود شے کے اپنے نفس سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم،، میں نفی ابوتِ جسمانی کی ہے اور روحانی ابوّت تو بہر حال آپؐ کی متحقق ہے ہی ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین، اسی وجہ سے کہا گیا ہے ،، لکن،، استدراکِ مشبہ ناشیہ مما مضیٰ کیواسطے آتا ہے تو ماکان محمد ابا احدٍ سے مطلقاً ابوت کی نفی ہوتی تھی اس لئے ،، لکن،، سے اس شبہ کو رفع کر دیا گیا۔ اور مطلب یہ ہوا کہ آپؐ رسول ہیں اور رسول روحانی باپ ہوتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ آپؐ امت کے روحانی باپ ہیں اور روح اصل ہوتی ہے۔ جسم بمنزل لباس کے تو فخرِ موجودات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مومنین کے ان کے اپنے ماں باپ سے زیادہ نزدیک ہوئے لہذا قرب بھی ثابت ہو گیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صاحب جمال بھی ہیں اور کمال کے مالک بھی اسیطرح محسن بھی ہیں اور قریب بھی اور ان تمام اوصاف کے اکمل ترین افراد آپؐ میں جمع ہیں۔ لہذا آپؐ کا احب من کل شئی،، ہونا محبت طبعی کی حیثیت سے بھی ضروری ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ محبت طبعی کے نتیجہ میں جو فریفتگی ہوتی ہے وہ آخر یہاں کیوں نہیں پائی جاتی؟ جواب یہ ہے کہ اس کی علت دراصل عدمِ استحضار ہے اگر ان اسباب کا استحضار ہو جائے تو فریفتگی بھی یقیناً پیدا ہو جائے گی۔ باب علامۃ الایمان حب الانصار

انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا انصار سے محبت رکھنا ایمان

کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا یہ نفاق کی علامت ہے
پورے ملک کو سخت ترین دشمن بنا کر ایک شخص کے اوپر پوری قوم کا جانیں نثار کر دینا تاریخِ عالم کے صفحات پر محض انصار کا عظیم کارنامہ ہے جو درحقیقت زریں حروف میں لکھے جانیکے قابل ہے اس کا اعتراف یورپ کے بھی بہت سے مورخین نے کیا ہے اور وہ اس پر مجبور ہیں ورنہ وہ ظالم تو اسلام کے اس قدر خطرناک دشمن ہیں کہ خدا کی پناہ! یہی وجہ ہے کہ حُبِ انصار علامت ایمان قرار دی گئی اور بغضِ انصار علامتِ نفاق. جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حب انصار کو علامتِ ایمان بتلایا ہے. علامت میں التزام ایک جانب سے ہے. یعنی اس کے پائے جانے پر شئی لالاینہ پائی جلئے گی لیکن اگر وہ علامت نہ ہو تو وہ شئے بھی نہ ہو، ایسا نہیں ہوگا. انصار سے اَوس وخزرج مراد ہیں. ان دونوں کو پہلے بنو قیلہ کہا جاتا تھا انصار ان کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا تھا اس لئے کہ ان مخلص لوگوں نے سارے عرب کو اپنا مہلک دشمن بنا کر آپؐ کی اور مومنین کی مدد کی تھی، انکی آخرت ان کے وعدے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی. کیونکہ انہوں نے صرف شہر کے اندر رہ کر مدد کا وعدہ کیا تھا لیکن وقت پڑنے پر ان حضرات نے باہر جا کر بھی آپؐ کی حمایت کی. خلافت کے بعد بنو امیہ ہمیشہ انھیں نیچے گرانے کی کوشش کرتے رہے. حضور نے فرمایا تھا کہ عنقریب ایسا وقت آئے گا جب تمہیں ایک جماعت دبانا چاہے گی،، اس پر انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس وقت کیا کریں؟ فرمایا صبر کرنا حتی تلقونی علی الحوض. چنانچہ انصار نے آپ کے اس قول پر اخیر تک عمل کیا.
فتح مکہ کے بعد انصار نے یہ سمجھا کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ ہی میں قیام فرمائیں گے اس لئے افسوس کر رہے تھے آپؐ نے فرمایا لوسلک الناس وادیا وسلکت الانصار وادیًا لسلکت وادی الانصار،، انصار میں بعض نوجوانوں کو آپؐ سے کچھ شکایت سی ہوگئی جبکہ "فتح حنین" کے بعد آپؐ نے مال کا اکثر حصہ مکہ اور نجد والوں کو تقسیم کر دیا آپؐ نے فرمایا کیا تم ان بکریوں کو میرے اوپر ترجیح دیتے ہو؟ کیا یہ اچھا نہیں کہ تم مجھے لیجاؤ اور وہ لوگ بکریاں لیجائیں؟ یہ سنکر

وہ آب دیدہ ہو گئے بے ساختہ رونے لگے اور رفینا رفینا کہنے لگے۔ انہی تمام چیزوں کے پیش نظر حب انصار کو آیتِ ایمان اور بغض انصار کو آیتِ نفاق قرار دیا گیا ہے۔

باب حدثنا ابو الیمان....ابو عبیدہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا درانحالیکہ آپ کے گرد صحابہ کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھ سے بیعت کرو اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو گے اور نہ چوری کرو گے اور نہ زنا کرو گے اور نہ اپنی اولاد کو قتل کرو گے اور نہ بہتان اٹھاؤ گے ایسا بہتان جسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں بنا لیا ہو۔ اور نیک کام میں نافرمانی نہ کرو گے پس تمہارے میں سے جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جو شخص مذکورہ برائیوں میں سے کسی میں مبتلا ہوا۔ (علاوہ شرک کے) اور دنیا میں اس کی سزا مل گئی یعنی اس پر حد جاری ہوئی یا وہ بیمار ہو گیا پس وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو چوری زنا، اور قتل وغیرہ میں سے کسی میں ملوّث ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس عیب کو کسی پر ظاہر نہ کیا، پردہ ڈھک لیا پس وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر چاہے اسے بخشدے ورنہ سزا دے۔ پس ہم تمام لوگوں نے ان سب چیزوں پر بیعت کر لی۔

لیلۃ العقبہ العقبہ منیٰ کے قریب ایک گھاٹی ہے مکہ کے طول سے ملنے والے کنارے پر جمرۃ العقبہ کے قریب۔ انصار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ انصار میں سے سات یا آٹھ آدمی حج کے لئے آئے تھے اور یہاں پر خیمہ زن تھے۔ آپ اُن کے یہاں تشریف لے گئے اور دعوتِ محافظت و اسلام پیش کی۔ ان لوگوں نے بغور آپ کا کلام سنا اور علیحدگی میں جا کر آپس میں مشورہ کیا کہ ممکن ہے یہ وہی نبی آخر الزماں ہوں جن کی بابت یہود تذکرہ کیا کرتے ہیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہمیں اس معاملہ میں جہانتک ہو سکے سبقت کرنی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤدبانہ عرض کیا کہ ہمارے

چند آدمی بازار گئے ہوئے ہیں وہ آجائیں تو پھر ہم کوئی فیصلہ کریں گے آپ بعد العشاء تشریف لائیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً نصف شب کے بعد تشریف لے گئے اور ان لوگوں سے مفصل باتیں کیں حتیٰ کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے، بہر حال یہ تو واقعہ پہلے سال کا ہے جبکہ آپ حج کے لئے تشریف لیگئے تھے جسکی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں، اور دوسرے سال حضرت عبادہ ابن صامت بھی تشریف لیگئے، بعد کو آپ نے بارہ نقیب (الناظر علی القوم ہو النقیب) متعین فرمائے جنمیں عبادہ ابن صامت بھی ہیں۔ عصابہ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تین سے لیکر چالیس تک افراد موجود ہوں ان لاتشرکوا باللہ شیئا شیئا نکرہ ہے جو سیاقِ نفی میں واقع ہے عموم کو مع الاستغراق چاہتا ہے شرک کی چار قسمیں ہیں شرک فی الصفات شرک فی العبادات شرک فی المصداق شرک فی الذات، مذکورہ تمام صورتوں میں شرک کی نفی مقصود ہے۔ ولا تقتلوا اولادکم سوال یہ ہے کہ نہی عن کل قتل ہونی چاہیئے تھی اس خصوصیت کی کیا وجہ ہے، جواب یہ ہے کہ یہاں مقصود رواج عرب کو ختم کرنا ہے وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو اس عار کی وجہ سے کہ وہ دوسروں کی فراش بنینگی اور بیٹوں کو تنگیٔ نفقہ کی وجہ سے قتل کر دیتے تھے باقی نفس محرمہ کی نہی کو آگے ذکر کیا گیا ہے۔ بہتان بہتان اس جھوٹ کو کہتے ہیں جسے مخاطب سنکر دنگ رہ جائے۔ بین ایدیکم وارجلکم ہذا کنایۃ عن الذات لان معظم الافعال یقع بہا فاجرہ علی اللہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک "علی" وجوب کے لئے نہیں ہے لیکن معتزلہ اسے وجوب کے لئے مانتے ہیں اب روایت کے اندر چند مباحث ہیں کفارہ کفر سے ماخوذ ہے اس کے معنی ستر کے ہیں، کافر کو کافر اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صنعتوں کا ساتر ہے، چھپانے والا ہے۔ رات کو بھی کافر کہا جاتا ہے نیز اس لفظ کا اطلاق کاشتکار پر بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی بیج کو کھیت میں چھپا دیتا ہے۔ رأیت الکافر یکفرنی کافر تو معلوم ہوا کہ عذاب دنیوی ساتر ہے اگر ایک شخص مرتد ہو گیا اور اس کے ارتداد وانکار عن التوبہ کی وجہ سے امام نے اسے قتل کرا دیا تو تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ قتل اس کے حق میں کفارہ نہیں ہوگا، بحث اس میں نہیں ہے بلکہ بحث اس میں ہے

کہ ایک مسلمان نے زنا کیا امام نے رجم کرا دیا یا کسی اور جرم کی بنا پر قتل کرا دیا یا مثلاً شراب پینے کے جرم میں کوڑے لگوا دیئے، اب آیا یہ رجم، یہ قتل اور یہ کوڑے اس کے حق میں کفارات ہوں گے یا نہیں۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدود کفارات منجیات نہیں ہیں، توبہ کرنا ضروری ہے اگر توبہ نہیں کی تو عند اللہ مواخذہ ہوگا۔ شوافع رحمہم اللہ علیہم اجمعین حدود کو کفارات منجیات من عذاب الآخرۃ مانتے ہیں اور روایت مذکورہ سے استدلال پیش کرتے ہیں۔ احناف رحمہم اللہ اپنے مذہب کے ثبوت میں آیت پیش کرتے ہیں والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیہما جزاءً بما کسبا نکالاً من اللہ الخ فرماتے ہیں کہ آیت میں حدود کو نکال بتلایا گیا ہے اور نکال اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو عبرت دلانے اور جرائم سے روکنے کے لئے سزا متعین کی جائے۔ شوافع آیت میں نکال [illegible] دونوں کے قائل ہیں، بنا بریں قطع ید کے بعد ان کے نزدیک توبہ کی کوئی ضرورت نہیں [illegible] امام اعظم کے نزدیک آخرت کی معافی کے واسطے توبہ ضروری ہے کیونکہ آیت میں ہے [illegible] ہے۔ اگر توبہ کی ضرورت نہ ہوتی تو پھر اس کے لانے کے کیا معنی؟ دوسری دلیل احناف کی دوسری آیت ولا تقبلوا لہم شہادۃً ابداً واولٰئک ہم الفاسقون الا الذین تابوا الخ ہے معلوم ہوا کہ حدِ قذف کے بعد رہائی اور قبولیتِ شہادت کے لئے توبہ بھی ضروری ہے۔ ان آیات کے سبب حنفیہ حدود کو زواجر مانتے ہیں، کفارات نہیں مانتے۔

روایتِ مذکورہ جو کہ امام شافعی رحمۃ اللہ کا مستدل ہے اولاً تو خبر واحد ہے دوسرے آیت کے معارض پڑ رہی ہے اسلئے قابل لحاظ نہیں گردانی جائیگی۔ پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا یہ ارشاد قضائً ہے یا رجاءً، دوسری روایات نے آکر فیصلہ کر دیا کہ یہ رجاءً ہے ترمذی شریف جلد ثانی صفحہ ۸۹ پر امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے حضرت علی سے ایک روایت نقل کی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ عذاب دے تو وہ اعدل ہے کہ دومرتبہ ان سے مواخذہ کرے اور اگر اللہ نے چھپا دیا تو وہ اکرم وستار ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کفارہ ہونا رجاءً ہے قضاءً نہیں، اور قرآن نے قضاءً کو بیان کیا ہے۔ یہی بات قوی تر ہے۔ اس صورت میں آیت و روایت میں کوئی تعارض

بھی نہیں رہتا۔ ورنہ ہم کہینگے کہ روایت مذکورہ بہرحال قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول عرش پر ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا فرش پر۔ بعض حضرات نے ایک جواب اور بھی دیا ہے وہ یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قوی روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا ادری الحدود کفارات لاہلہا ام لا۔ چونکہ حضرت عبادہ کا واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے اور حضرت ابوہریرہ کی روایت ظاہر ہے کہ اس کے بعد کی ہے اس لئے عبادہ ابن صامت کی روایت منسوخ اور ابوہریرہ کی روایت ناسخ کے درجہ میں ہے مگر اس جواب پر کلام کیا جاسکتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ عبادہ کو تین مرتبہ بیعت کا موقع ملا ہے۔ ایک مرتبہ تو یہی جو روایت میں مذکور ہے اور دوسری دفعہ فتح مکہ میں اور تیسری بار حجۃ الوداع میں اس لئے عبادہ والی روایت کو مقدم نہیں کہا جاسکتا۔ اور پھر اسلام ابوہریرہ کے تاخر سے روایت کا متاخر ہونا تو لازم نہیں آتا۔ بایں وجہ جواب پہلا ہی صحیح ہے ـــــ ایک بحث یہاں ترجمۃ الباب کے ذکر نہ کرنیکی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مصنفؒ کا ترجمۃ الباب قائم کرنیکا ارادہ تو تھا مگر موت نے فرصت نہیں دی اور یہ باب ترجمہ سے خالی رہ گیا۔ لیکن یہ جواب کوئی معقول جواب نہیں ہے کیونکہ مصنفؒ نے سولہ سال کی مدت میں کتاب لکھی ہے اور پھر نوّے ہزار طالبعلموں کو پڑھائی بھی ہے۔ فرصت نہ ملنے کی آخر کیا وجہ؟ صحیح تر جواب یہ ہے کہ باب بلا ترجمہ کالفصل من الباب السابق کے درجہ میں ہے۔ یہاں بھی مقصود حبِ انصار من الایمان سمجھانا ہے۔ اس لئے کہ جن لوگوں سے بیعت لی جارہی ہے یہ وہی اللہ کے مخلص و نیک بندے اور رسول اللہ کے ہلکے سے اشارے پر گردنیں پیش کردینے والے انصار ہیں، جنہوں نے پوری دنیا کی مخالفت مول لیکر آپؐ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور آپؐ کی دعوت پر لبیک کہا۔ نیز اس ہدایت سے مصنفؒ کا مقصد مرجیہ و کرامیہ اور معتزلہ و خوارج کی تردید کرنا بھی ہے اس لئے کہ روایت سے معلوم ہوا کہ، اعمال بھی داخلِ ایمان ہیں۔ مرجیہ و کرامیہ کا یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ فقط "قول" ایمان ہے۔ نیز معتزلہ و خوارج کی یہ بات بھی کسیطرح وزن دار نہیں کہ تارک اعمال خارج

اسلام ہے کیونکہ روایت کے اندر ان شار عفار عنہ فرمایا گیا ہے۔

باب من الدین الفرار من الفتن حدثنا... ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عنقریب مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے چرانیکو پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور پانی گرنے کی جگہوں میں پھرے گا، اپنا دین بچانے کیلئے فتنوں سے گریز کرے گا۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ فرار من الفتن دین ہی میں سے ہے تو اس سے دین کا ترتب ثابت ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایمان اور دین وغیرہ مترادف الفاظ ہیں قرآن میں ہے ان الدین عند اللہ الاسلام" دوسری جگہ ارشاد ہے ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ" ایک اور جگہ باری تعالی نے فرمایا ہے فاخرجنا من کان فیہا من المومنین فما وجدنا فیہا غیر بیت من المسلمین" ان تمام آیتوں سے ایمان و اسلام اور دین کا باہمی ترادف بحسب المصداق ثابت ہو جاتا ہے۔ مصنفؒ یہاں اسبات کو بتلانا چاہتے ہیں کہ ایمان کے اندر محض اعمال مثبتہ ہی داخل نہیں ہیں بلکہ سلبیہ بھی داخل ہیں بدینہ کی ب معیت کے واسطے ہے ای مع دینہ ونیز سببیہ بھی ہو سکتی ہے ای بسبب دینہ۔ اس روایت کے مطابق عمل اس وقت ہوگا جبکہ اجتماعی زندگی گذارنے میں خیریت نہ ہو اور لفظ "یوشک" بھی اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب فتنوں کا دور ہوگا تو اس وقت خیریت اسی میں ہوگی کہ لوگ باہر رہیں۔ یہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا تخلی بہتر ہے یا اختلاط۔ بالناس۔ بعض لوگوں نے اختلاط بالناس کو اولی کہا ہے۔ کیونکہ ایسا اگر نہ ہوگا تو اجتماعی معاملات، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد وغیرہ سے متعلق امور متروک ہو کر رہ جائینگے تنہائی میں رہنے والا ان امور کو ظاہر ہے کہ ادا نہیں کر سکتا۔ مسلمان کے لئے کسطرح مناسب نہیں کہ باطل پوری قوت کے ساتھ اسلام پر حملہ آور ہو، مہیب فتنے اٹھ رہے ہوں اور اسلام کے نام لیوا میدان چھوڑ کر پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں جا چھپیں یا حجروں کے دروازے بند کرلیں۔ اللہ تعالی

کے نزدیک ایسے لوگوں کا وہی مرتبہ ہوگا جو بادشاہ کے نزدیک ان فوجیوں کا ہوتا ہے جو وقت پڑنے پر پیٹھ پھیر جائیں۔ اسلامی جذبہ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر مسلمان بڑے سے بڑے فتنہ کا منہ پھیرنے کیلئے ہر وقت اور ہر طرح مستعد رہے۔ بالفرض اگر کامیابی نہ بھی ہو تب بھی کم ازکم "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مقامِ وفاداری پہ پہنچنا لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان رکھنے والے کا اولین فرض ہے۔

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خودشکنی خودنگری کا

دوسری جماعت کہتی ہے تخلّی وعزلت نشینی بہتر ہے کیونکہ اس سے کم از کم اپنے دین کی حفاظت تو ہوتی ہے۔ محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جماعتی شکل میں اپنے دین کی حفاظت اور اجتماعیت کے حقوق ادا کر سکتا ہے تو اس کے لئے اختلاط اولی ہے اور اگر بھٹک جانیکا خطرہ یا لغزشوں کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں تنہائی وعلیحدگی ہی بہتر ہے۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا اعلمکم باللہ وان المعرفۃ فعل القلب۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو کوئی امر فرماتے تو ان کی طاقت کے مطابق اعمال کا حکم فرماتے۔ لوگ کہتے یا رسول اللہ ہم آپ کی طرح نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے تمام ذنوب معاف کر دئے ہیں۔ آپ غصہ میں بھر جاتے حتی کہ غصہ آپ کے چہرے پر نمایاں ہو جاتا۔ پھر فرماتے میں یقیناً بہ نسبت تمہارے زیادہ ڈرتا ہوں اور تمہارے سے زیادہ جانتا ہوں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے دیکھا کہ مکان پر تین شخص کھڑے ہیں آپ نے دریافت فرمایا کیا بات ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اہل بیت سے آپ کی بابت معلومات حاصل کر رہے تھے کہ آیا آپ رات بھر جاگتے ہیں یا سوتے ہیں، معلوم ہوا کہ کچھ دیر جاگتے ہیں۔

اور کچھ دیر سوتے ہیں دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ صائم الدھر ہیں یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ نہیں۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو قلیل سمجھا اور اس کی علت آپ کا مغفور ہونا خیال کیا اور اپنے لئے طے کر لیا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی چاہئے۔ ایک نے کہا کہ میں تادمِ زیست شادی نہیں کروں گا، خصی ہو جاؤں گا۔ کیونکہ شادی کی صورت میں ذمہ داریاں بڑھتی ہیں، پریشانیاں نزول ہوتی ہیں، جس کی بدولت سکونِ قلب حاصل نہیں رہتا اور عبادت کے لئے خشوع وخضوع ضروری ہے جو بلا سکونِ قلب ممکن نہیں دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھنے کی نذر کرتا ہوں تیسرے نے نذر کی کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز میں مشغول رہا کروں گا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان باتوں کا علم ہوا تو آپ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور یہ جملے بیان فرمائے جو روایت میں مذکور ہیں۔ آپ نے فرمایا رہبانیت تقویٰ نہیں ہے۔ تقویٰ وہ ہے جسے میں اختیار کئے ہوئے ہوں۔ اب اس جگہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں (۱) ترجمۃ الباب کو کتاب الایمان سے کیا تعلق ہے (۲) وان المعرفۃ فعل القلب کو ماقبل سے کیا مناسبت ہے؟ (۳) روایت کو ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے؟۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ جسطرح ایمان کے اندر یقین سب کے نزدیک ضروری ہے اسیطرح علم ومعرفت کے اندر بھی یقین ظاہر ہے ان المعرفۃ اللہ تعالیٰ والعلم بہ من الایمان۔ یعرفونہ کما یعرفون ابنائہم علم ومعرفت میں باہمی صرف اتنا فرق ہے کہ علم میں کلیات کا ادراک ہوتا ہے اور معرفت میں جزئیات کا۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ بھولی ہوئی چیز کا یاد آجانا معرفت ہے اور علم میں مسبوقیت بالا دراک شرط نہیں، نیز اس سے مصنف رحمہ اللہ کا مقصد کرامیہ کی تردید بھی ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں ایمان صرف اقرار باللسان کا نام ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اشارہ کر رہے ہیں کہ الایمان ہو اولبعضہ فعل القلب

دوسرے سوال کے جواب میں کہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے انی اعلمکم ارشاد فرما رہے ہیں اور علم بھی افعال میں سے ہے۔ بلکہ افعال میں یہی سب سے زیادہ اشرف ہے

کیوں؟ اس لئے کہ یہ فعل قلبی ہے اور قلب افضل ہے بہ نسبت دوسرے اعضاء کے، نیز اس سے زیادتی ونقصان کا پتہ بھی چلتا ہے جو مصنف رحمہ کا عین مقصد ہے۔ اب رہی یہ بات کہ روایت کو ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے سو وہ ظاہر ہے۔

متکلمین کہتے ہیں الایمان لایزید ولاینقص اشاعرہ وماتریدیہ بھی اس کے قائل ہیں کہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور وہ کم وزیادہ نہیں ہوتا۔ محدثین وشوافع اعمال کو داخلِ ایمان مانکر ایمان میں زیادۃ ونقصان کے قائل ہوگئے۔ غالباً مصنف رحمہ اللہ اس جگہ متکلمین کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ تمہارے خیال میں نفس ایمان میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انا اعلمکم" فرماتے ہیں یعنی میرے پاس علم تمہارے سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ قلوب کے اعمال ہوتے ہیں اور زیادۃ ونقصان کو قبول کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے بما کسبت قلوبکم، ای عملت قلوبکم۔ لیکن ہم کہیں گے کہ "اعلمکم" میں جو کمی وزیادتی مفہوم ہوتی ہے وہ درحقیقت کیف کے اندر ہے اور ہم اس کے منکر نہیں۔ بلکہ ہم تو خود اس کی بابت گذشتہ تقریر میں کہکر آئے ہیں کہ کیفیت ہی کے اعتبار سے علم الیقین اور حق الیقین کی تقسیمات ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ ہم جسکی نفی کرتے ہیں وہ اصل میں کمیت کے اندر ہے حقیقت میں یہ نزاع لفظی ہے کیونکہ محدثین زیادۃ ونقص فی الکیف کے قائل ہیں اور متکلمین زیادۃ ونقص فی الکم کی نفی کرتے ہیں۔ بہرحال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ آپ اپنے لئے اشق چیز اختیار فرماتے تھے اور امت کے لئے اسہل۔ رات کا اکثر حصہ آپ عبادت میں صرف کرتے تھے۔ اولاً چار رکعت نماز پڑھی اس طرح کے پہلی رکعت میں سورہ بقرہ دوسری میں آل عمران تیسری میں نسا، چوتھی میں مائدہ پھر کچھ دیر سوگئے اور پھر اٹھے غرض یہ کہ، اسیطرح آپ کم ازکم پچاس رکعتیں ضرور پڑھتے تھے۔ روزوں کا حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ نصف سال روزے رکھتے تھے مگر جب عبداللہ عمر بن العاص نے اس پر عمل کرنا چاہا تو آپ نے منع فرمادیا اذا امرہم صحابہ نے عرض کیا ہم آپ کی طرح عمل کرکے کیونکر نجات پاسکتے ہیں

آپ کی بات تو یہ کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کے ذنوب بخشدے ہیں یہ سنکر آپؐ کو غصہ آگیا۔ آپؐ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ فرمایا ان اتقاکم و اعلمکم باللہ انا،، اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذنوب کا ارتکاب ہوا ہے البتہ بعد میں ان کی مغفرت کر دی گئی۔ حالانکہ اہلِ سنت والجماعت محققین کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء صغائر و کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے قبل النبوۃ وبعد النبوۃ زمانہ کی تقسیم کی ہے ان کے نزدیک بھی بعد النبوۃ انبیاء تمام صغائر وکبائر سے معصوم ہیں؟ جواب یہ ہے غفر مستلزم وجودِ ذنب نہیں بلکہ اس کے معنی ستر کے ہیں اور ستر کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ شے موجود ہو لیکن اسپر پردہ ڈالدیا جائے دوسری صورت ہے کہ فعل و فاعل کے درمیان کوئی چیز حائل ہوجائے یہاں یہی شکل ہے یعنی زمانہ گذشتہ اور آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اور ذنوب کے درمیان حائل و مانع ہوکر وجود ذنب کو ناممکن العمل بنادیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ذنب سے مراد ترکِ اَولیٰ وافضل ہے انبیاے کرام کی اور خصوصًا آپؐ کی جلالت شان کے لحاظ سے افضل کو چھوڑ دینا اور فاضل پر عمل کرنا گویا کہ ذنب ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ جسطرح واسئل القریۃ سے مراد واسئل اہل القریۃ ہے اسی طرح من ذنبک سے عبارت من ذنب امتک ہے

باب من کرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ ان یلقیٰ فی النار من الایمان حدثنا۔۔۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس شخص میں تین چیزیں موجود ہوں اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔ ایک یہ کہ اللہ اور رسول اس کے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں دوسرے یہ کہ جس سے دوستی رکھے فقط اللہ ہی کیلئے رکھے۔ تیسرے یہ کہ کفر کی جانب رجوع ایسا ہی خطرناک جانے جیسا کہ آگ میں گرنیکو جانتا ہے ۔

اس باب میں کراہت عود فی الکفر کو بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی ایمان کے اجزائے مکملات میں سے ہے

کفر سے اسقدر کراہیت پائی جائے جیسے تمام مادیات میں ذوی الارواح کو آگ سے محسوس ہوتی ہے۔ حلاوۃ ایمان کو مٹھائی سے تشبیہ دی گئی ہے مٹھائی میں جسطرح استلذاذ ہوتا ہے اگر اسی طرح ایمان میں استلذاذ پایا جائے مومن اسے محسوس کرلے، تو یہ سمجھئے کہ اس نے حلاوتِ ایمان کو پالیا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ حلاوت حسی ہوگی، جیسے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل تھی کہ ہزار ہا مصائب کے پہاڑ ٹوٹنے کے باوجود زبانِ مبارک سے ہمیشہ احد احد ہی نکلتا رہا یہ حلاوت ایمانی ہی کا تو اثر تھا معلوم ہوا کہ حضرت بلال رضؓ کو حلاوتِ حسی حاصل ہوگئی تھی، دوسری جماعت کی رائے ہے کہ حلاوت سے حلاوتِ معنوی مراد ہے۔ ومن احب عبداً لایحبہ الا اللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سات اشخاص اسوقت اللہ تعالیٰ کے سائے تلے ہوں گے جبکہ کوئی سایہ نہیں ہوگا یعنی میدان حشر میں، ان میں ایک شخص وہ بھی ہوگا جس نے ہر کسی سے محبت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کی۔ یہ انتہائی متقی اور پرہیزگار ہے۔

روایت کے آخری ٹکڑے کے مخاطب مرتدین ہیں جو اسلام لانے کے بعد پھر کفر میں داخل ہوگئے۔ انقذہ اللہ اسکا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مومن پیدا ہوا۔ اور پھر اس نے کفر کو اختیار کرلیا۔ اور ایک ترجمہ وقفہ سے کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تو اسے ایمان کی توفیق بخشی مگر اس نے بدبختی سے اس کو ترک کردیا، کفر اختیار کرلیا۔

باب تفاضل اہل الایمان فی الاعمال حدثنا۔۔۔۔ سعید خدری رضؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جنت میں داخل کرے گا اور اہل نار کو دوزخ میں پھر فرمائے گا کہ جس شخص کے قلب میں رائی کے برابر بھی ایمان ہے اسکو دوزخ سے نکالو۔ پس وہ دوزخ سے نکالے جائیں گے اس حال میں کہ سیاہ ہوں گے، پھر نہر حیا یا حیات (یہ مالک کا شک ہے) میں ڈالے جائیں گے۔ پس ایسے جمیں گے جیسے دانہ پانی کے کنارے پر جمتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ زرد

رنگ کا خوشبو دار نکلتا ہے۔ حدثنا.... ابی سعید ہی سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں سو رہا تھا میں نے دیکھا کہ لوگ میرے سامنے کئے گئے اور ان پر کرتے پڑے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا کرتا چھاتی تک ہے اور بعضوں کا اس سے نیچے عمر ابن الخطاب سامنے کئے گئے ان پر ایسا کرتا تھا جسے وہ گھسیٹتے جاتے تھے یعنی بہت لمبا اصحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے اس کی کیا تعبیر لی ہے۔ فرمایا کہ دین +

زیادتی و نقص جس طرح ایمان میں ثابت ہے اسیطرح اعمال میں بھی اس کا ثبوت ظاہر ہے بلکہ اعمال ہی کی بدولت ایمان میں کمی و زیادتی بیان کی جاتی ہے بہر حال جو لوگ مستحق ہوں گے اللہ تعالیٰ کے انعام کے یعنی جن کے اعمال صالحہ غالب ہوں گے اعمال قبیحہ پر وہ جنت میں داخل ہوں گے اور جو لوگ اس کے مستحق نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان کے اعمال صالحہ اعمال قبیحہ پر غالب ہوں گے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہوگا وہ جہنم میں جائیں گے۔ بعد میں رحمت باری ظہور پزیر ہوگی۔ حکم ہوگا کہ جس کے قلب میں رائی کے دانہ کی برابر بھی ایمان ہے اس کو دوزخ سے نکال لیا جائے۔ کافر و مشرک بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے اور معتوب مومنین بھی لیکن، مومنین کا جہنم میں داخلہ اکراماً ہوگا جیسے سنار سونے کو آگ میں ڈالتا ہے کندن بنانے کیلئے یا دھوبی کپڑے کو خم میں ڈالتا ہے صاف کرنے کیلئے فتعزیر المومن یکون اکراماً۔ بخلاف کافر کے کہ وہ جہنم میں اہانتہً ڈالا جائیگا فتعذیب الکافر یکون اہانتہً۔ مثقال ایک وزن ہے جو ۴½ ماشہ کا ہوتا ہے نیز مثقال دینار کو بھی کہتے ہیں لیکن یہاں اس کے معنی مقدار کے ہیں۔ یہ لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ اس وقت یہ بالکل کوئلے کیطرح سیاہ ہوں گے لیکن رحمتِ باری جلد ان پر متوجہ ہوگی۔ الحیاء او الحیاۃ جنت کی ایک نہر کا نام ہے اس کی تاثیر یہ ہوگی کہ جو چیز اس میں ڈالدی جائیگی اس میں زندگی آجائے گی، وہ شے منور جائے گی۔ کما تنبت الحبۃ حبہ خرفہ کا بیج خرفہ ایک سبزی ہے

اس کو بقلۃ الحمقار بھی کہا جاتا ہے اس وجہ سے کہ یہ تقریبًا سب ہی جگہ اگ آتی ہے بس تھوڑا سا موقع ملنا چاہیئے. چنانچہ سیلاب کیوجہ سے جو کوڑا کرکٹ کنارے لگ جاتا ہے اس پر بھی بہت جلد اس کے پودے نکل آتے ہیں تو جو لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے ان کی حالت نہایت بری ہوگی، بجرمی ہوئی ہوگی انھیں نہر حیا میں ڈالدیا جائے گا. وہاں ان کی شکل وصورت اعضائے جوارح غرض ایک ایک چیز بہت جلد درست ہوجائے گی خرفہ کے بیج کے اگ آنیکی طرح. پھر جنت میں داخلہ ہوگا. اس روایت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تفاضلِ ایمان کے بارے میں کہا جارہا ہے مگر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اعمال کے متعلق؟ اس کا جواب یہ ہے کہ روایت کے آخر میں لفظ خیر بھی لایا گیا ہے اور خیر کا اطلاق ایمان وعمل دونوں پر ہوتا ہے نیز بسا اوقات ایمان کا اطلاق بھی عمل پر ہوتا ہے. بنابریں کہا جائیگا کہ روایت کو ترجمۃ الباب سے مناسبت ہے.

اشکال کیا جاتا ہے کہ اعمال میں وزن کی کیا صورت ہوگی؟ امام الحرمین اور بہت سے علماء فرماتے ہیں کہ صحائفِ اعمال کے وزن کا اعتبار ہوگا. دوسرے کہتے ہیں کہ اولاً اللہ تعالیٰ اعمال میں جسمیت پیدا کر دے گا اور پھر وزن کیا جائے گا. علاوہ ازیں اور بھی جوابات دیئے گئے ہیں. مگر یہ تمام باتیں اس وقت کی ہیں جبکہ اشکال پیدا ہوتا تھا باقی آج کی دنیا میں یہ اشکال نہیں ہوسکتا کیوں؟ اس لئے کہ سائنس تمام اعراض وجواہر وغیرہ کا وزن کرکے دکھلا رہی ہے. اہل سائنس نے ایسے آلات ایجاد کر لئے ہیں جن سے حرارت وبرودت وغیرہ جیسی اشیاء کا وزن بہت جلد کر لیا جاتا ہے. قرآن کہتا ہے فاما من ثقلت موازینہ فہو فی عیشۃ الراضیہ. دوسری روایت میں "التدیّ" کا لفظ ہے. اس میں "دین" کو قمیص سے تشبیہ دی گئی ہے جسطرح قمیص عیوب جسمانی کو چھپا لیتی ہے. سردی اور گرمی سے محفوظ رکھتی ہے. اسی طرح "دین" آدمی کو جملہ آفات دینوی واُخروی سے مامون رکھتا ہے. مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دینی لحاظ سے بالکل مکمل ہیں، ان کے اعمال سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں آپؐ کا ارشاد ہے ان اللہ

ینطق علیٰ لسان عمر" روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا مقام جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی بڑھا ہوا ہے حالانکہ صدیق کا مرتبہ جو کہ سب سے بلند تر ہے صرف ابوبکرؓ کو حاصل ہے۔ آپ نے فرمایا خدا نے جو میرے قلب پر ڈالا وہ میں نے ابوبکرؓ کے قلب میں ڈالدیا یہی وجہ ہے کہ ابوبکرؓ نے اہم سے اہم موقع پر بھی معجزہ طلب نہیں کیا؟ جواب یہ ہے کہ روایت سے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت مفہوم ہوتی ہے یہ دراصل فضیلتِ جزوی ہے ورنہ حقیقت میں مقام ابوبکرؓ ہی کا سب سے زیادہ اونچا ہے۔ افضل الناس بعد الانبیاء ابوبکر۔

باب الحیاء من الایمان حدثنا.... سالم ابن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کے قریب ہو گذرے وہ اپنے بھائی کو حیاء کے متعلق نصیحت کر رہے تھے، یعنی شرم و حیاء سے منع کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا اسے چھوڑ دو اس لئے کہ حیاء ایمان کی علامت ہے۔

ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ دین و مذہب میں حیاء ایمان کا حصہ ہے لیکن علمی معاملہ میں حیاء کرنا کسی طرح درست نہیں بلکہ جو ایسا کرے گا وہ جاہل رہ جائے گا اور جہالت ہی آدمی کیلئے سب سے بڑا خسارہ ہے۔ لایتعلم العلم مستحی ولا متکبر۔ سمجھداری کی بات یہی ہے کہ جب اپنے سے کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکے تو بہرحال کسی دوسرے سے اس کے حل کرنے میں شرم و حیاء قطعاً دامن گیر نہ ہونی چاہیئے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء بالعلم سے سختی کے ساتھ روکا ہے لیکن تمہارے سے اگر کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے تو تم ضرور اس کا جواب دیتے ہو خواہ تمہیں مسئلہ کا ذرا سا بھی علم نہ ہو۔ چنانچہ بسا اوقات تم لوگوں کے بتلائے ہوئے مسئلے غلط ہوتے ہیں۔ بیچارے جاہل آدمی اسی کو راہ عمل بنا لیتے ہیں۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ صرف اس وجہ سے کہ کہیں تمہارے علم کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے کہ مولوی صاحب سے ایک مسئلہ معلوم کیا گیا تھا وہ اسے بھی نہ بتلا سکے۔ یہ اصل میں حیاء نہیں ہے بلکہ جبن ہے۔ حیاء وصف حسن ہے، برائی کے خوف سے انسان میں ایک انفعالی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی کو

حیار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو یہ شخص حیار کی وجہ سے اکثر اپنے حقوق نہیں مانگتا تھا اس لئے اسکا
بھائی اسے شرم دعار دلا رہا تھا آپؐ نے فرمایا دعہ فان الحیار من الایمان۔ دوسری جگہ ارشاد ہے
اذالم تستحی فافعل ماشئت۔ حیار جس شخص کے اندر ہوگی بہرحال معاصیات کی طرف بڑھنے سے
اسے روکے گی۔ دامن پکڑیگی۔ باب فان تابوا واقاموا الصلوٰة واٰتوالزکوٰة فخلوا سبیلھم

حدثنا..... ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم ہوا ہے جبتک کہ وہ لاالٰہ الا اللہ و
ان محمد الرسول اللہ کی شہادت نہ دیں، نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ نہ دیں۔
اور جب انہوں نے ان باتوں پر عمل کر لیا تو میری جانب سے نہ ان کی جانوں کو
کوئی خطرہ ہے اور نہ ان کے مالوں کو۔ مگر دین کی حق تلفی کا بدلہ باقی رہے گا
اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

فان تابوا الخ یہ سورہ توبہ کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے کہا گیا ہے کہ مشرکین سے قتال کرد اور اگر
وہ کفر و شرک سے تائب ہوجائیں اور نماز قائم کرنے لگیں، زکوٰۃ دینے لگیں تو انھیں چھوڑ
دو، ان سے جنگ مت کرو۔ معلوم ہوا کہ توبہ کے ساتھ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ
بھی ضروری ہے۔ مشرکین مومنین کاملین اسی وقت ہوسکتے ہیں جبکہ مذکورہ چیزوں کو قبول کرلیں
ان پر عمل پیرا ہو جائیں۔ درحقیقت اصل شے تو توبہ ہی ہے لیکن تخلیہ سبیل کے لئے اقامت
صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ بھی لازمی ہے اب ان کے دیار واموال محفوظ ہو جائیں گے البتہ اسلامی
حقوق باقی رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے قتل کا ارتکاب کیا یا شراب خوری میں
مبتلا ہوا تو اسپر دوسرے مسلمانوں کی طرح حدِ شرعی جاری ہوگی۔ بہرحال یہاں بھی مصنف
رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد کرامیہ و مرجیہ پر رد کرنا ہے وہ کہتے ہیں کہ نجات کے لئے صرف لاالٰہ
الا اللہ محمد رسول اللہ، کہنا کافی ہے، عمل کی کوئی ضرورت نہیں روایت سے پتہ چلتا ہے
کہ فقط ایمان سے کام نہیں چلیگا اور نہ صرف توبہ ہی سے کچھ ہوگا۔ بلکہ ایمان کے ساتھ ساتھ

اعمال صالحہ نماز روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ اعمال بھی ضروری ہیں حدیث سے یہ بھی دریافت ہو رہا ہے کہ جو لوگ ان اعمال کو قبول نہ کرینگے مرتکب ہوں گے ان سے جنگ کی جائے گی حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں اور اس کے امر و نواہی پر عمل پیرا ہوجائیں۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ قرآن میں آیا ہے۔ حتیٰ یعطوا الجزیۃ الخ کفار سے تین مطالبے کئے جائیں گے، اسلام لاؤ یا جزیہ دو یا پھر لڑائی کے لئے تیار ہوجاؤ۔ تو حدیث بہ ظاہر آیت کے خلاف اور معارض پڑ رہی ہے۔ اس اشکال کے مختلف جوابات دیے جاتے ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیت کے نزول سے پہلے کا ہے اس وقت کا حکم یہی تھا اور جب آیت نازل ہوگئی تب جزیہ کے ذریعہ اس میں توسیع کر دی گئی — دوسرا جواب ہے کہ "الناس" میں الف لام عہد ذہنی ہے اس سے مراد صرف مشرکین عرب ہیں۔ یہود و نصاریٰ یا دوسرے ممالک کے رہنے والے کافر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حتیٰ یعطوا الجزیہ کا حکم مشرکین عرب کے لئے نہیں ہے بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے ہے۔ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ مشرکین عرب سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ ان کے لئے دو ہی صورتیں ہوں گی۔ ایمان لائیں یا جنگ کے لئے آمادہ ہوجائیں۔ اب یہ اشکال نہ ہونا چاہئیے کہ قرآن کہتا ہے لااکراہ فی الدین۔ وما انت علیہم بجبار۔ وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر، کیونکہ "ان اقاتل الناس" ایسے ہی ہے جیسے ڈاکٹر جسم کے فاسد اور بیکار گوشت کا آپریشن کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جسم سے علیحدہ کر دے تاکہ جسم کے دوسرے حصوں میں اس کا فساد سرایت نہ کرنے پائے۔ جیسے ڈاکٹر کا یہ فعل قرین قیاس ہے بالکل اسی طرح "امرت ان اقاتل الناس" بھی قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ مشرکین عرب پر حق پوری طرح واضح ہوچکا ہے وہ عربی داں ہیں قرآن و حدیث کو اچھی طرح سمجھتے ہیں نیز اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کے سامنے ہے، آئے دن بڑے بڑے معجزات ان کی نظروں سے گذرتے رہتے ہیں۔ عقلی اعتبار سے ان کے پاس کوئی ایسا عذر نہیں جسے قبول اسلام سے مانع تصور کیا جائے

سوائے تعصب و ہٹ دھرمی کے لہذا کہا جائے گا کہ مشرکین روحانی لحاظ سے عرب کا وہ فاسد عنصر ہیں جسکا آپریشن سخت ضروری ہے۔ پھر جیسے ڈاکٹر آپریشن میں عجلت سے کام لیتا ہے سستی و تاخیر جائز نہیں سمجھتا اسی طرح مشرکین کو اب یعنی حق واضح ہو جانے اور ان کی جانب سے کوئی معقول عذر پیش نہ کئے جانے پر مہلت نہیں دی جائیگی۔ بخلاف ان کفار مشرکین کے کہ جو دوسرے ممالک میں رہتے ہیں، عربی زبان سے قطعاً ناواقف ہیں اور نہ رسول کی شخصیت ان کے سامنے ہے انہیں بلاشبہ اسلام کو سمجھنے کا موقعہ دیا جائے گا حتی یعطوا الجزیہ کا حکم انہی لوگوں کے لئے ہے۔ البتہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ آنے پر ان سے بھی جزیہ اٹھالیا جائے گا۔ کیونکہ اُس وقت یہ مہلت اپنی انتہا پر پہنچ جائیگی۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ قتال کی دو قسمیں ہیں قتال بالسیف قتال باللسان لوگوں سے بحث و مناظرہ کرنا، انہیں اسلام سے متعلق پوری پوری معلومات بہم پہنچانا جزیہ لینا اور ذمی بنانا۔ یہ تمام صورتیں قتال کی قسم ثانی میں داخل ہیں تو درحقیقت امرت ان اقاتل الناس سے دونوں طرح کا قتال مراد ہے نیز اس توجیہ میں ہر وہ عمل داخل ہے جس کے ذریعہ اسلام کو غالب اور باطل کو مغلوب بنانیکی جد وجہد کی جائے۔ باب من قال ان الایمان

هو العمل الخ حدثنا..... ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا ای العمل افضل؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا،، قیل ثم ماذا؟ فرمایا حج مبرور۔

اوّلاً مصنف رحمہ اللہ نے ثابت کیا تھا کہ اعمال ایمان کے اجزاء ہیں اس کے بعد ترقی کر کے تصدیق قلبی کو عمل قرار دیا۔ اب فرماتے ہیں کہ خود ایمان عمل ہے۔ اطلاقاتِ شرعیہ میں عمل کا اطلاق ایمان پر ہوتا ہے۔ بخاریؒ کی عادت ہے کہ جب کوئی مسئلہ قوی ہوتا ہے تو خود اس کے مدعی بنتے ہیں اور اگر مسئلہ مختلف فیہ ہو، بخاری کے نزدیک قوی نہ ہو تو من قال کے ساتھ

ترجمۃ الباب قائم کرتے ہیں. مرجیہ وکرامیہ کا قول ہے کہ ایمان فقط اقرار باللسان کا نام ہے
اس باب سے اول تو ان گمراہ لوگوں کی زبردست تردید مقصود ہے دوسرے ان لوگوں
پر حجت قائم کرنی ہے جو ایمان وعمل میں مغایرت کے قائل ہیں اور قرآن کی ان آیات
سے استدلال پیش کرتے ہیں جنمیں عمل کا عطف ایمان پر موجود ہے. جیسے والذین اٰمنوا و
عملوا الصالحات سے فیما بین ایمان وعمل مغایرت ظاہر ہوتی ہے جو نصوص کتاب اللہ اور
استعمالات سلف کے خلاف ہے اس لئے مصنفؒ نے اس باب میں ثابت کر دیا کہ عمل کا
اطلاق ایمان پر شرعاً مسلّم ہے اور عمل ایمان کو بھی شامل ہے کتاب اللہ میں جو عمل کا
عطف عام علی الخاص المزید الاہتمام سمجھنا چاہیئے جیسے حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ میں
عطف عام علی الخاص ہے. امام بخاری رحمہ اللہ اپنی بات کے ثبوت میں تین آیتیں پیش کر رہے
ہیں. تلک الجنۃ التی اورثتموہا بما کنتم تعملون. اب اگر عمل کے اندر ایمان کو داخل نہ مانا جائے تو
دخولِ جنت بغیر ایمان لازم آئیگا درانحالانکہ روایاتِ صریحیہ نے یہ بات ثابت کر دی کہ ایمان
دخولِ جنت کے لئے موقوف علیہ ہے اسی وجہ سے اکثر شراح نے تعملون کا ترجمہ تومنون
سے کیا ہے مگر اس سے بخاریؒ کے اوپر اعتراض پڑ سکتا ہے اس لئے کہ شریعت محض عمل کو
ایمان قرار نہیں دیتی. اس لئے تعملون کے معنی ایسے عام ہونے چاہئیں جو ایمان واقرار اور
اعمال جوارح سب کو شامل ہوں اسی وجہ سے شیخ الہند رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ایمان کا
ترجمہ جاننا یا تصدیق کرنا مناسب نہیں ان تراجم سے ایمان کی مکمل حقیقت واضح نہیں ہوتی
بلکہ بہتر یہ ہے کہ ایمان کا ترجمہ "ماننا" کیا جائے اس سے التزام طاعت و فرمانبرداری کا مفہوم
بھی ادا ہو جاتا ہے. شاعر اسی مقصد کو اپنی زبان میں یوں ادا کرتا ہے۔

بس آنی ہی تو کسر ہے تم میں کہنا نہیں مانتے کسی کا

اورثتموہا اگر کوئی یہ کہے کہ وراثت نام ہے البقاء المال بعد الموت لمن یستحقہ کا اور یہ اللہ
تعالیٰ کے یہاں ممتنع ہے لہذا اس جگہ وراثت کا کیا مطلب ہوگا؟ جواب میں کہدو کہ یہ باب تشبیہ

سے ہے جیسے وراثت کے اندر اعطار ہوتا ہے ایسے ہی مراد یہاں بھی ہے ای اعطیتموا ھا۔ رہا وہ تعارض جو مذکورہ آیت اور حدیث لن یدخل احدکم الجنۃ بعملہ) میں پیش آرہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل بما کنتم میں ب سببیہ نہیں ہے بلکہ ملابسہ ہے ای اور ثتموھا ملابستہ لاعمالکم ای لثواب اعمالکم نیز فتح الباری میں ہے کہ حدیث میں جو دخول جنت بعمل کی نفی ہو رہی ہے وہ حقیقت میں وہ عمل ہے جو عند اللہ مقبول نہ ہو۔ اور آیت میں جس عمل کا اثبات ہے وہ، وہ عمل ہے جو مقبول ہو۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر انسان کے لئے جنت میں بھی جگہ ہے جہنم میں بھی عمل صالح کی بنار پر بہشت کا بہترین باغیچہ بطور انعام عطا کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ جگہ بھی دیدی جاتی ہے جو نتھو سنگھ یا رام پرشاد وغیرہ کو ملنے والی تھی اور یہ لوگ جب جہنم میں جائیں گے تو انھیں اپنی جگہ کے ساتھ ساتھ عبد اللہ یا محمود کے نام کی جو جگہ تھی وہ بھی دیجائیگی۔ اسی طرح وراثت قائم مقام ہر ایک کیلئے ہوگی۔ فوربک لنسئلنہم اجمعین عما کانوا یعملون یہاں بھی مراد ایمان ہی ہے۔ اسیطرح لمثل ہذا فلیعمل العاملون، میں عمل ہی عبارت ایمان ہے جو اقرار وعمل اور تصدیق کا مجموعہ ہے۔ تو محدثین ان آیات سے استدلال کرتے ہیں کہ ایمان پر بھی عمل کا لفظ بولا جاتا ہے اس سلسلہ میں حدیث صحیح بھی وارد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا ایّ العمل افضل؟ آپ نے فرمایا ہو الایمان باللہ اس سے معلوم ہو گیا کہ عمل چند اجزار پر مشتمل ہے جنمیں افضل ایمان ہے۔ پس یہ بات واضح ہوگئی کہ ایمان عمل کے اندر داخل ہے نہ وہ خارج ہے اور نہ عین ہے۔ حج مبرور۔ بعضوں نے کہا ہے کہ حج مبرور سے مراد حج مقبول ہے اور بعضوں کی رائے یہ ہے کہ حج مبرور سے وہ حج مراد ہے جسمیں نہ فسوق ہو نہ جدال اور نہ رفث۔ بعض دوسرے لوگوں نے یوں کہا ہے کہ حج مبرور وہ حج ہے۔ جو خالصۃً لوجہ اللہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پر ایمان کے بعد جہاد کو افضلیت کا درجہ دیا ہے۔ دوسری روایت میں برّ الوالدین اور تیسری میں صلوٰۃ کا

ذکر موجود ہے۔ اسیطرح ایک ہی سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟
اس کے دو جواب ہیں پہلا جواب یہ ہے کہ سائلین کے اختلاف کی وجہ سے جوابات میں اختلاف
پیدا ہو گیا اگر آپؐ کو معلوم ہوا کہ سائل جہاد سے دامن بچاتا ہے تو آپؐ نے جہاد کی اہمیت پر نسبتہً
زیادہ زور دیا تاکہ اس کے قلب میں اسکا احساس پوری طرح جاگزیں ہو جائے اور اگر آپؐ
نے دیکھا کہ سائل کے تمام اعمال تو درست ہیں لیکن نماز میں ذرا کوتاہی کرتا ہے تو آپؐ نے افضل
الاعمال صلوٰۃ کو فرمایا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دراصل سوال نوع کا ہے، فرد کا نہیں، پس یہاں مقصد یہ
ہے کہ کون کونسی چیزیں ایسی ہیں جن کے اندر افضلیت کا تحقق پایا جاتا ہے۔ اس جواب کی بنا ر
پر من محذوف مانا جائے گا اور عبارت یوں ہو گی من افضل الاعمال کذا وکذا۔

باب اذلم یکن الاسلام علی الحقیقۃ الخ حدثنا... سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو کچھ مال دیا میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔
پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو چھوڑ دیا جو میرے نزدیک نیک تھا
میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیا بات ہے آپؐ نے فلاں آدمی کو کچھ نہیں دیا، حالانکہ
قسم ہے اللہ کی میں اس کو مومن دیکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا بلکہ مسلمان۔ میں کچھ
دیر خاموش رہا پھر میرے اوپر میرا علم غالب آگیا، میں نے وہی بات کہی، آپؐ نے
بھی وہی جواب دیا۔ میں نے تھوڑے سے سکوت کے بعد پھر اپنی بات لوٹائی۔ آپؐ
نے پھر وہی جواب دیا۔ اس کے بعد فرمایا اے سعد میں بعضے آدمی کو مال دیتا ہوں درانحالیکہ
میرے نزدیک دوسرا شخص بہت پیارا ہوتا ہے۔ اس خوف سے کہ اللہ تعالیٰ
اسے دوزخ میں اوندھا نہ ڈالدے +

پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ عمل ایمان کا جزء ہے اور پھر یہ ثابت کیا گیا کہ عمل کا اطلاق ایمان
پر دونوں کے باہمی تلازم کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ مصنفؒ یہاں ایک مختلف فیہ مسئلہ کو چھیڑ رہے
ہیں، لیکن ان کی عبارت میں تعقید پیدا ہو گئی اور یہ تعقید تقدیم وتاخیر اور حذف کی وجہ سے ہوئی ہے

عبارت کی توضیح یوں ہوگی کہ گویا کوئی سائل مصنف سے کہہ رہا ہے کہ آپ نے ایمان و اسلام اور دین کو متحد مانا ہے، حالانکہ قرآنی آیات خود ان کے درمیان فرق ثابت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قالت الاعراب اٰمنا قل لن تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔ اس میں ایمان کی نفی ہے اور اسلام کا ثبوت۔ پس معلوم ہوا کہ اسلام بغیر ایمان کے پایا جا سکتا ہے۔ اس سے ایمان و اسلام کا فرق ظاہر ہے؟ اس کا جواب بخاریؒ یوں دے رہے ہیں کہ اسلام کا اطلاق کبھی حقیقۃً ہوتا ہے اور کبھی مجازاً۔ اطلاق حقیقی انقیاد باطنی پر ہوتا ہے اور مجازاً انقیاد ظاہری کو اسلام کہتے ہیں۔ جن آیات میں اسلام و ایمان کے مابین فرق مترشح ہوتا ہے وہاں اسلام بالمعنی المجازی اور ایمان بالمعنی الحقیقی ہے اور جن آیات میں اتحاد مفہوم ہوتا ہے وہاں اسلام بھی بالمعنی الحقیقی ہے۔ اب کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ ترجمۃ الباب کی عبارت یوں ہوگی اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ ای الانقیاد الباطنی بل کان علی الاسلام الظاہری لطمع الغنیمت او الخوف من القتل، فہو اطلاق مجازی یہ خبر محذوف ہے۔ تو تعقید کے تین سبب ہوئے طمع کا محذوف ہونا خبر کا محذوف ہونا اور و کا بمعنی بل ہونا۔

حضرت سعد ابن ابی وقاص سابقین اولین میں سے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور انہی کی تبلیغ سے ایمان بھی لائے ہیں، مالک عن فلاں ای معرضاً عنہ او مسلما یہ عطف تلقینی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان انی جاعلک للناس اماما، پر حضرت ابراہیم نے فرمایا ومن ذریتی، یہ عطف تلقینی ہے، مطلب یہ ہے کہ مجھے اور میری ذریت کو امام بنائے گا۔ دوسری جگہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی انی اسکنت بواد غیر ذی ذرع.... وارزقہم من الثمرات جناب باری تعالیٰ نے تلقیناً فرمایا ومن کفر اسی طرح یہاں بھی عطف تلقینی ہے اور مقصد یہ ہے کہ تم ان کو یقینی اور حتمی طور پر مومن نہ کہو، کیونکہ انقیاد باطنی کا علم تمکو نہیں ہو سکتا۔ البتہ یوں کہو کہ وہ مسلم ہیں۔ اس لئے کہ انقیاد ظاہری، بہر حال پایا جاتا ہے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ واو کو معنی میں بل کے مانا جائے جیسے باری تعالیٰ کے ارشاد "الی مائۃ

الف اَو یزیدون،، کے اندر اَو معنی میں بل کے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے کلام میں لفظ اَو شک کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ بہرحال مراد یہ ہے تم مومن نہ کہو بلکہ مسلم کہو۔ اس روایت سے ایمان و اسلام کے فرق کی جو نوعیت ہے وہ سمجھ میں آگئی۔ سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ،،اَو مسلماً،، کی طرف توجہ نہ کرنا تمام توجہ الیٰ ہذا الرجل کی وجہ سے ہے۔

باب افشاء السلام من الاسلام الخ حدثنا..... عبد اللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کونسا اسلام بہتر ہے؟

فرمایا یہ کہ تو لوگوں کو کھانا کھلائے اور واقف و ناواقف کو سلام کرے ؛

سلام سے مراد ابتداء بالسلام ہے۔ ہر مسلمان کو خواہ اسے جانتا پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو بہرحال سلام کرنا چاہئے مگر یہ اسلام کا ایسا جز نہیں ہے جسکے معدوم ہونے سے اسلام بھی معدوم ہو جائے

الانصاف من نفسک مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تم اپنے لئے بہتر سمجھتے ہو وہی دوسروں کے لئے بھی بہتر سمجھو۔ اشکال ہوتا ہے کہ قرآن میں ہے یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو الخ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ فاضل عن الحاجۃ کو صدقہ کرنا چاہئیے اور یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ انفاق فی الاقتار مناسب ہے۔ اس لئے دونوں میں تعارض پیدا ہو گیا۔ تطبیق کی شکل یہ ہے کہ انفاق فی الاقتار افضل ہے ان لوگوں کے واسطے جو انفاق کے بعد باوجود فقر کے، سوال کی طرف راغب نہیں ہونگے۔ اور قل العفو کا حکم ان لوگوں کے لئے ہے جنھیں اندیشہ ہو بعد الانفاق سوال کی ذلت میں مبتلاء ہو جانے کا۔ ایک طرف ہمارے سامنے یہ واقعہ آتا ہے کہ ایک صاحب جمعہ کے دن آئے اور سوال کیا چنانچہ انہیں ایک چادر دیدی گئی دوسرے جمعہ کو دوسرے صاحب آئے پہلے سائل نے اپنی وہ چادر انھیں دینی چاہی، لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا، اور دوسری جگہ خود آپؐ کا ارشاد ہے خیر الصدقۃ ماکان عن ظہر غنی۔ ایک طرف تو حاجت کے وقت خرچ نہ کرنے پر اسقدر تشدد ہے، دوسری طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جسم کے لباس کے سوا اور سب کچھ لاکر رکھدیتے ہیں اور انھیں بجائے کچھ کہنے کے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر فضیلت کی ڈگری دی جاتی ہے۔ پس ان نصوص اور واقعات میں باہمی تعارض کی کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ اصل میں یہ اختلاف مراتب کا نتیجہ ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے اونچے مقام پر پہنچ گئے تھے کہ سارا مال و متاع خرچ کرنے کے بعد بھی ان کی ذات سے سوال کا احتمال نہیں تھا اور دوسرے صحابہ اس بلند مقام پر نہیں تھے۔

باب کفران العشیر وکفر دون کفر۔ حدثنا۔۔۔۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھے دوزخ دکھائی گئی ہے۔ اس کی مستحق اکثر عورتیں ہیں اس لئے کہ یہ کفر (ناشکری) کرتی ہیں۔ لوگوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتی ہیں؟ فرمایا شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کو فراموش کر دیتی ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی کے ساتھ زمانہ تک بھلائی کرتے رہو۔ پھر اگر تمہارے سے کوئی بات ایسی ہو جائے جو ان کی مرضی کے خلاف ہو، تو کہیں گی میں نے تمہارے سے کبھی نیکی نہیں پائی۔

کفر کے معنی چھپانے کے ہیں، ستر کے ہیں کافر کو کافر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو چھپاتا ہے اور ان کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ یوں تو ساری مخلوقات ہی جناب باری سبحانہ و تعالیٰ کی بے کنار رحمتوں سے ڈھکی ہوئی ہیں لیکن خصوصی طور پر انسان ہمیشہ سے رحمتِ حق کا مرکز توجہ رہا ہے۔ شریعت لفظِ کفر کا استعمال ترکِ ایمان میں کرتی ہے اسجگہ کفر سے مراد کفرانِ عشیر ہے یعنی شوہر کی نعمتوں کا چھپانا۔ کفر دون کفر یہ کفر کے کلی مشکک ہونے کا بیان ہے کہ بعض افرادِ کفر اعلیٰ مقام پر ہیں بعض ادنیٰ پر۔ پس بعض کے ارتکاب کی وجہ سے انسان فاسق ہو جاتا ہے اور بعض کی وجہ سے مخلد فی النار اور بعض کی وجہ سے لایق ملامت۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ کفران عشیر بھی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی حالت میں ناشکری پسند نہیں من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ لیکن کفران عشیر کی وجہ سے خلود فی النار کا تحقق نہیں ہوتا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفر بمعنی عدم شکر ہو یا بمعنی ترک ایمان، بہرحال کفر ایمان کے متغایر ہے پھر اس کو کتاب الایمان میں بیان کرنے کا آخر کیا مطلب؟ جواب یہ ہے کہ تعرف الاشیار

باضداد ہا کے اعتبار سے کفر کے ذکر سے ایمان کی وضاحت ہوتی ہے اس لئے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز جب کفر میں تشکیک پائی جاتی ہے تو ایمان میں بھی تشکیک پائی جائے گی۔ اگر جہل و تاریکی کلی مشکک ہے تو علم و نور بھی کلی مشکک ہے۔

باب المعاصی من امر الجاہلیۃ الخ حدثنا ۔۔۔ احنف ابن قیس سے روایت ہے کہتے ہیں میں اس شخص (علی) کی مدد کے لئے جار ہا تھا کہ راستہ میں ابو بکرہ ملے۔ پوچھا کہ کہاں کا قصد ہے؟ میں نے جواب دیا اس شخص کی مدد کے لئے جار ہا ہوں بولے کہ واپس لوٹ جائے، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے کہ جب دو مسلمان تلوار لیکر ایک دوسرے کے مد مقابل ہوں (از روئے عداوت) تو قاتل و مقتول دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ قاتل تو بسبب ظلم کے دوزخی ہوا مگر مقتول کا کیا قصور؟ فرمایا وہ بھی تو اپنے حریف کے قتل پر حریص تھا۔ حدثنا ۔۔۔ معرور کہتے ہیں کہ میں ابوذر سے ربذہ میں ملا وہ اور ان کا غلام دونوں ایک لباس میں تھے، میں نے اس مساوات کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا میں نے ایک مرتبہ ایک شخص کو گالی دی تھی، اس کی ماں پر عیب لگایا تھا پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اباذر کیا تو نے اس کی ماں پر عیب لگایا ہے؟ تو ایسا آدمی ہے کہ تیرے اندر جاہلیت کی خو باقی ہے۔ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، تمہارے خدمتگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ماتحت کیا ہے۔ پس جس کا بھائی جس کے ماتحت ہو اس کو چاہئے کہ اپنا ہی جیسا اسے کھلائے اور اپنا ہی جیسا پہنائے۔ اور تم ان سے ایسا کام نہ لو جسے وہ برداشت نہ کرسکیں، ورنہ پھر تم بھی ان کے ساتھ تعاون کیا کرو۔

اسلام سے قبل کا زمانہ جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے کیونکہ اس وقت معاصی انتہائی کثرت سے صادر ہوتے تھے اسی لئے المعاصی من امر الجاہلیت، فرمایا گیا ہے، تو گیا اس کی وجہ سے آدمی

اسلام سے خارج ہوجائے گا؟ ترجمۃ الباب کے اس پہلے جملے سے معتزلہ وخوارج کا مذہب ثابت ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اسی کی تردید کے لئے ولا یکفر صاحبہا بارتکابہا الخ لایا گیا وجہ یہ ہے کہ جاہلیت کے دور میں کفر وشرک ہی کے افعال ہوتے تھے۔ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ معتزلہ ومحدثین اعمال کو خواہ وہ امور ہوں یا ترک ایمان کے اندر داخل مانتے ہیں۔ پھر معتزلہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اعمال ایمان کے اجزائے مقوّمہ ہیں جن کا سلب مستلزم ہے ایمان کے سلب کو۔ محدثین اعمال کو اجزاء تو مانتے ہیں، لیکن اجزائے مکملہ وتنزینیہ مانتے ہیں۔ اسی لئے یہ حضرات کہتے ہیں لایکفر صاحبہا بارتکابہا، اور وان طائفتٰن من المؤمنین اقتتلوا سے محدثین کے دعویٰ کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ عن الا حنف بن قیس احنف ابن قیس حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامیوں میں سے ہیں، تلوار لیکر ان کی حمایت کے لئے جارہے ہیں حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی جنگ کا زمانہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ کی شہادت کے بعد جب حضرت علی مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ اب آپ خلیفہ ہو گئے ہیں فوراً حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دیجئے گا۔ حضرت علی تامل سے کام لے رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت علی چاہتے تھے جب تک حالات پوری طرح قابو میں نہ آجائیں اس وقت تک صبر سے کام لینا چاہیئے۔ جبکہ مخالفین کی طاقت بھی کوئی معمولی طاقت نہیں ہے۔ بہرکیف حضرت علی کرم اللہ وجہہ حق پر تھے اور حضرت امیر معاویہؓ رضی اللہ عنہ اجتہادی غلطی پر، نیت دونوں کی خیر تھی۔ اس دوران میں صحابہ کی تین جماعتیں ہوگئی تھیں ایک جماعت امیر معاویہؓ کے ساتھ دوسری حضرت علی کے اور تیسری جماعت متوقف تھی۔ ابو بکرہ اسی تیسری جماعت سے متعلق تھے۔

انہ کان حریصاً علیٰ قتل صاحبہ اس سے معلوم ہوا کہ ارادۂ کبیرہ بھی قابل مواخذہ ہے۔ حالانکہ جمہور اس کے مخالف ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہاں محض عزم ہی نہیں بلکہ عمل بھی موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عمل قاتل کامیاب ہے اور عمل مقتول ناکام۔ لقیت اباذرؓ بالربذہ۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ صحابہ میں سے بڑے زاہد اور بہت مشہور صحابی ہیں، ان کا مسلک

تھا کہ حاجت سے زیادہ مال کنز ہے جسپر قرآن نے انسان کو معذب بتایا ہے جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ ما اُدّی زکوٰتہ فلیس بکنز۔ اسی وجہ سے حضرت امیر معاویہؓ سے انکا جھگڑا ہوا۔ یہ روم پر لشکر کشی کے سلسلے میں بھیجے گئے تھے۔ جب لوگوں میں غنائم کی تقسیم شروع ہوئی تو انہوں نے اس کو کنز بتلایا۔ لشکر کی کمان یزید ابن معاویہ کر رہا تھا۔ اس نے حضرت معاویہؓ کو اسبات کی اطلاع دی، حضرت معاویہ نے حضرت ابوذرؓ کو --- بلا کر سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ نہ مانے تو امیر معاویہ نے انھیں خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجدیا۔ حضرت عثمان سے تبادلۂ خیال کے بعد بھی یہ اپنی ہی رائے پر قائم رہے۔ اس وقت مدینہ میں بہت سا مال آیا ہوا تھا۔ اسوجہ سے لوگوں کے ساتھ ان کا کافی جھگڑا رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو "ربذہ" بھیجدیا اب یہ فقط جمعہ کے دن مدینہ آیا کرتے تھے۔ ربذہ میں ان کی ساتھ ان کے غلام اور ان کی رفیقۂ حیات تھیں۔ چنانچہ حضرت ابوذر کی وفات وہیں ہوئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا رحم اللہ علیٰ ابی ذر یعیش وحیداً ویموت وحیداً۔

حلہ ایک ہی رنگ کی چادر اور تہبند کو کہتے ہیں۔ اس زمانے کی عادت تھی کہ آقا لوگ نہایت ہی شاندار اور بہت قیمتی ملبوس میں رہا کرتے تھے اور بے چارے غلام اور محکوم انسان نہایت خستہ حالت میں، لیکن حضرت ابوذر رضی اللہ اور آپ کے غلام کا ایک ہی طرح کا حلہ تھا۔ دوسری توجیہ یہ ہوگی کہ ایک ہی حلہ کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا یعنی تہبند اگر ایک کے پاس تھا تو چادر دوسرے کے پاس۔ انی سابت رجلا بعض شراح نے لکھا ہے کہ وہ انہی کا غلام تھا اور حبشی تھا۔ اس کو انہوں نے یا ابن سودا کہدیا۔ اور بعضوں نے کہا کہ حضرت بلالؓ کو انہوں نے ایسا کہا تھا۔ بہر حال مذکورہ دونوں روایتوں سے ثابت ہوگیا کہ معاصی امر جاہلیت میں سے ہیں اور ان کے ارتکاب کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جائے گی جیسے کہ خوارج و معتزلہ کرتے ہیں۔ تکفیر جس طرح شرک حقیقی سے کی جاتی ہے اسی طرح انکار رسالت وغیرہ سے بھی کی جاتی ہے۔ بایں وجہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ میں یہ سب بھی داخل ہیں۔

توبہ کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ بعض گناہوں کو حسنات کی وجہ سے معاف کر دیتے ہیں بخشدیتے ہیں، لیکن یہ مخصوص ہے غیر شرک کے ساتھ۔ پس ان الحسنات یذھبن السیئات" میں سیئات سے عبارت غیر شرک ہے البتہ توبہ کے ذریعہ ہر طرح کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں بجوائے حقوق العباد کے!

مصنفؒ نے ترجمہ اُولیٰ (المعاصی من امر الجاہلیۃ) سے مرجیہ وکرامیہ کی تردید کی ہے۔ اور ترجمہ ثانیہ (لایکفر صاحبہا الا بارتکابہا) سے تردید کی ہے معتزلہ وخوارج کی اور تائید کیواسطے وان طائفتٰن من المومنین اقتتلوا، کو نقل کیا گیا۔ باب ظلم دون ظلم حدثنا...... عبداللہ سے روایت ہے کہتے ہیں جس وقت یہ آیت الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم، نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا ہمارے میں سے کونسا ایسا ہے جو ظلم نہیں کرتا اس پر حق تعالیٰ نے ان الشرک لظلم عظیم، آیت نازل فرمائی ؛

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولٰئک لہم الامن وہم مہتدون ظلم کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں ضد عدل کے یعنی وضع الشی فی غیر محلہ کے۔ اور دوسرے معنی تصرف فی ملک الغیر کے ہیں۔ یہاں ظلم نکرہ ہے، تحت نفی میں واقع ہے اس وجہ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ایمان لائے۔ اور ہر طرح کے ظلم سے احتراز کیا، انہی کے لئے نجات منحصر ہے۔ اس پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا یا رسول اللہ کون آدمی ہر طرح کی لغزشوں اور بے اعتدالیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اس پر آیت نازل ہوئی۔ ان الشرک لظلم عظیم۔ معلوم ہوگیا کہ ظلم کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ کوئی ظلم بڑا ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹا، لیکن شرک ظلم عظیم ہے۔ اور یہ بھی دریافت ہوگیا کہ شرک کی انواع متغایر ہیں اور نیز یہ بھی پتہ چلا کہ اس آیت سے مراد عام ظلم نہیں ہے بلکہ ظلم عظیم یعنی شرک مراد ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ نکرہ تحت نفی میں مفید عموم ہوتا ہے۔ پھر یہاں ظلم سے ایک مخصوص ظلم کیسے مراد لیا جاسکتا ہے؟ تو صحابہ نے جو سمجھا وہ موافق قاعدہ تھا، اور جناب رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھا وہ اس کے مخالف؟ شراح یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے قاعدہ کی طرف نشاندھی کی ہے یعنی اذا اطلق المطلق یراد بہ الفرد الکامل. مگر عمدہ تر جواب یہ ہے کہ آیت میں لَم یلبسوا کہا گیا ہے اور التباس اتحادِ مکانی کے وقت ہوتا ہے، اگر اختلاف مکانی ہو تو التباس نہیں ہوتا اور ایمان امرِ قلبی ہے فلہذا اس کا التباس بھی اسی ظلم سے ہو سکتا ہے جو قلبی ہو اور وہ شرک ہے. اس لئے مراد شرک ہی ہوگا۔ باب، علامت المنافق ۔ حدثنا۔۔۔۔ ابی ہریرہ سے روایت ہے کہ آپ نے

فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں جب کوئی بات کہے جھوٹ بولے، جب کوئی وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ حدثنا۔۔۔ عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار باتیں جس شخص کے اندر پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر ان چاروں باتوں میں سے ایک خصلت ہوگی اس میں ایک ہی خصلت نفاق ہوگا تا وقتیکہ اس خصلت کو چھوڑ نہ دیا جائے جبکہ امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب کوئی بات کہے جھوٹ بولے جب کسی سے عہد کرے تو خلاف ورزی کرے، جب کسی سے جھگڑے تو نامناسب کہے۔

منافق کے بارے میں قرآن کہتا ہے اِنَّ المنافقین فی الدرک الاسفل من النار. لفظ منافق اسلامی اصطلاحی لفظ ہے۔ اسلام سے پہلے یہ لفظ مستعمل نہیں تھا البتہ قبل از اسلام نفاق کا اطلاق جنگلی چوہے (یربوع) پر کیا جاتا تھا۔ یربوع کے بل کے دو راستے ہوتے ہیں۔ اگر ایک جانب سے دشمن اس پر حملہ آور ہوتا ہے تو یہ اسے دھوکہ دیکر دوسری جانب سے صاف بچکر نکل جاتا ہے. منافق کی بھی یہی شکل ہوتی ہے کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ ایک دروازے سے اسلام میں داخل ہوتا ہے دوسرے دروازے سے مسلمانوں کو دھوکہ دیکر نکل جاتا ہے یا یہ کہ وہ کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے، تو بہر حال منافق کے معنی خادع کے ہوئے کیونکہ

یہ شخص مخلص فی الاسلام نہیں یوں اگرچہ اسلام ظاہر کرتا ہے لیکن پس پردہ ہوتا ہے کافر ہی اس لئے اسلام کو جس قدر شدید نقصان اس کی ذات سے پہنچتا ہے دوسروں سے اس کا امکان کم ہے، ہاں تو لفظ منافق عرف شرع میں استعمال ہوا ہے پہلے اس کا استعمال ان معنی میں نہیں تھا۔ منافقین نے اسلام کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کو دیکھکر منافقت کا خطرناک طریقہ اختیار کیا تاکہ مسلمانوں کی جانب سے نہ کوئی تکلیف پہنچے! اور نہ کوئی اندیشہ باقی رہے۔ نفاق کی دو صورتیں ہیں یعنی نفاق کبھی فی العقیدہ ہوتا ہے اور کبھی فی العمل جس شخص میں دوسرا نفاق پایا جائے گا وہ کافر تو نہیں ہوگا البتہ فاسق ضرور ہوگا۔ مصنف رح علاماتِ نفاق کو بیان فرما رہے ہیں پہلی روایت میں نفاق کی تین علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ گفتگو میں جھوٹ بولنا۔ وعدہ خلافی کرنا امانت میں خیانت کرنا۔ دوسری روایت میں نفاق کی چار خصلتیں مذکور ہیں، دو تو یہی ہیں تیسری خصلت ہے اذا عاہد غدر اور چوتھی ہے اذا خاصم فجر۔ فجور میلان عن الحق کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اذا عاہد غدر اور اذا وعد اخلف، کو ایک ہی صفت مانا جائے۔ بہرحال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق میں کمال اس وقت بتایا ہے جبکہ مذکورہ بالا چاروں صفتیں پائی جائیں۔ اور صرف ایک یا دو کی صورت میں نفاق ناقص ہوگا۔ نفاق و ایمان میں باہمی تضاد ہے لہٰذا نفاق میں کمی و زیادتی کے ثبوت سے ایمان میں بھی زیادت و نقصان ثابت ہوگا حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کی حفاظت کریں گے، وَانا لہ لحافظون، مگر اس کے برخلاف یوسف علیہ السلام کو ہلاک کرنے کی کوشش کی، یوسف علیہ السلام ان کے ساتھ بطور امانت تھے، انھوں نے خیانت کی اور والد محترم کے سوال پر اکلہ الذئب، کا بہانہ پیش کیا۔ معلوم ہوا کہ آیاتِ نفاق تینوں کی تینوں (وا ذا حدث کذب واذا اؤتمن خان واذا وعد اخلف) ان پر منطبق ہو رہی ہیں، درانحالیکہ بعض لوگ انھیں نبی کہتے ہیں اور ولی تو کم از کم سب ہی مانتے ہیں۔ اب سوال ہے کہ یہ حدیث صحیح معنی پر کیسے محمول کی جا سکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں مراد اعتبار ہے یعنی ہمیشہ جھوٹ بولے ہمیشہ خیانت کرے، ہمیشہ وعدہ خلافی کرے، اور ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے

محض ایک بار ان چیزوں کا صدور ہوا ہے اس لئے اشکال نہ ہونا چاہئے مگر ایک دوسرا شبہ ہوتا ہے کہ یہاں لفظ اذا ہے اور جزئیت شخصیہ کیلئے ہے، استغراق کے لئے نہیں، جواب ہے کہ لفظِ اذا سے اسجگہ استغراق ہی مراد ہے۔ دوسرا جواب دیجئے کہ یہ نفاق فی العقیدہ نہیں ہے بلکہ نفاق فی العمل ہے لہٰذا اس سے ان کی ولایت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ قبل از نبوت کا ہے اور ممکن ہے کہ نبی سے قبل از نبوت کسی لغزش کا صدور ہو جائے۔ نیز ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں حضرت یعقوب علیہ السلام دوسرے بیٹوں کی جانب زیادہ توجہ نہیں فرماتے تھے اس لئے بتقاضۂ محبتِ خداوندی استنقاذ من النبی کے خیال سے انھوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ معاملہ کیا۔ ان کا یہ عمل دنیا کی وجہ سے نہیں بلکہ بوجہ اللہ ہے اور بہت سے غلط امور بوجہ اللہ ہونے کی وجہ سے اپنی سطح سے بہت بلند ہو جاتے ہیں۔ ہارون علیہ السلام نے قوم سے جہاد نہیں کیا اس خیال سے کہ کہیں بنی اسرائیل میں اختلاف کی مہلک وبا نہ پھیل جائے۔ چنانچہ اسی نیت حسنہ کی وجہ سے وہ لائق صد تحسین رہے، ان کے ترک جہاد کو کسی طرح گناہ نہیں کہا جاسکتا! پس دروغ گوئی، دعدہ خلافی اور دوسری چیزیں اسی وقت نفاق کی علامات سمجھی جائیں گی جبکہ نفسانی خواہشات اور دنیاوی تقاضوں کے باعث ہوں، اِس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بَل فَعَلَهٗ کَبِیْرُھُم ہٰذا" کہنا، یا حضرت سارہ سے فرمانا کہ جس وقت جبار ظالم میرے متعلق پوچھے تو کہدینا میرا بھائی ہے"، یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کا مذکورہ معاملہ کرنا اور ہارون علیہ السلام کا قوم کے ساتھ جہاد نہ کرنا گویا کہ مصداق حدیث ہے ہی نہیں۔ انما لامر ما نوی۔ ایک جواب اور سنئے وہ یہ کہ نفاق کلی مشکک کے درجہ میں ہے اور کلی مشکک کا صدق درجات متفاوتہ پر ہوتا ہے، اپنے تمام افراد پر صدق ساوی نہیں ہوتا۔ البتہ کلی متواطی کا صدق اپنے تمام افراد پر مساوی ہوتا ہے۔ باب قیام لیلۃ القدر من الایمان۔ حدثنا... ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ایمان اور ثواب کی خاطر شب قدر میں جاگے گا اس کے ـــــ گذشتہ تمام گناہ بخشدئے جائیں گے۔

القدر بمعنی العظمۃ۔ یہ رات بڑی ہی خیر و برکت کی رات ہوتی ہے۔ اس رات میں عالم ارواح انسانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے فرمایا گیا انا انزلناہ فی لیلۃ القدر وما ادراک ما لیلۃ القدر الخ اللہ تعالیٰ اس مبارک رات میں رزق و حیات سے متعلق احکامات سے (جو لوح محفوظ میں درج ہیں) متنظمین ملائکہ کو مطلع فرماتا ہے۔ جبریل علیہ السلام مقدس ملائکہ کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کو ذکر اللہ میں مشغول پاتے ہیں ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اذا کان لیلۃ القدر نزل جبریل علیہ السلام فی کبکبۃ من الملائکۃ یصلون علی کل عبد قائم و قاعد یذکر اللہ عزّ و جلّ ــــ لیلۃ القدر کی تعیین میں بڑا اختلاف ہے ایک جماعت کہتی ہے کہ اس کے لئے کوئی رات متعین نہیں بلکہ مختلف راتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس قول سے احادیث مختلفہ میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا یہی قول ہے، مگر یہ رمضان المبارک کی لیالیٔ عشرۂ اخیرہ میں انتقال کے قائل ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کیلئے تمام سال میں ایک ہی رات متعین ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ لیلۃ القدر تمام سال میں دائر سائر ہے اور یہی خیال حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے۔ بعض لوگ رمضان کی تمام راتوں میں دائر مانتے ہیں پھر کوئی طاق میں دائر مانتا ہے اور کوئی زوج میں۔ امام شافعیؒ کا میلانِ خاطر اس طرف ہے کہ شبِ قدر رمضان کی اکیسویں اور تیئیسویں میں بدلتی سدلتی رہتی ہے۔ غرض یہ کہ اس بارے میں تقریباً پچاس اقوال ہیں۔ شبِ قدر، اسم اعظم، ساعتِ جمعہ اور رجل و ولی اللہ یہ چار چیزیں ایسی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں پر افشا نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اچھے خاصے نیک آدمی بھی در اصل بہت سی غلط باتوں کا ارتکاب کر بیٹھتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ قدر کی تعیین کا علم دیا گیا آپؐ صحابہ کرام کو خوشخبری سنانے کیلئے باہر نکلے، راستہ میں دیکھا کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے ہیں، آپؐ ان میں صلح کرانے لگے اس عرصہ میں لیلۃ القدر کی تعیین کا علم آپؐ کے ذہن مبارک سے نکل گیا، دیکھیئے یہ ہے باہمی لڑائی کی نحوست! امام بخاری رحمہ اللہ علیہ یہاں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ فرائض و نوافل سب کے سب ایمانِ کامل کے اجزاء ہیں۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ایمان کے اجزاء صرف فرائض ہیں اور

نوافل نہیں ـــ باب الجہاد من الایمان ۔ حدثنا ... حدیث قدسی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ بزرگ و برتر اس شخص کا کفیل ہے جو اس کے راستہ میں جنگ کیلئے محض ایمان یا تصدیق رسالت کے تقاضے سے نکلے، میں اس کو اجر یا غنیمت کے، ساتھ جو اس نے حاصل کی ہے، گھر کی جانب لوٹاؤں گا یا اس کو بہشت میں داخل کرونگا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر اپنی امت کیلئے دشوار نہ سمجھتا تو ہمیشہ لشکر کے ساتھ جنگ میں شریک رہتا۔ مجھے محبوب ہے کہ اللہ کے راستہ میں شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کر دیا جاؤں ۔

قیام لیلۃ القدر کی طرح فرمایا گیا الجہاد من الایمان مگر یہ تکمیلاً ہے تقویماً نہیں۔ انتداب بمعنی تکافل ہے یعنی متکفل۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کا کفیل ہے جو اس کے راستہ میں جہاد کیلئے نکلے سنگلاخ راہوں، تاریک وادیوں، مہیب خطروں اور ہر قسم کی جانگسل و صبر آزما صعوبتوں سے بے نیاز ہو کر۔ ہم اللہ کی راہ میں نکلنے سے ڈرتے ہیں، ہمیں جان عزیز کے تلف ہو جانے کا خوف رہتا ہے اس بناپر ہم طرح طرح کی مصلحتوں کا سہارا لیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جذبۂ حق ہمیشہ مصلحتوں کی آڑ سے بے نیاز رہا ہے۔ دشمنانِ اسلام خصوصاً انگریز اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ مذہب قتل و خوں ریزی کو نہ صرف یہ کہ مٹانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کے برخلاف فرض قرار دیتا ہے چنانچہ ان بدبختوں نے اسلام کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ابتک کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام میں جو جہاد فرض ہے اس کا مقصد قتل و خوں ریزی نہیں ہے، عدل وانصاف قائم کرنا ہے، بڑھتے ہوئے ظلم وطغیان کو روکنا ہے، دبے ہوئے لوگوں کو ابھارنا ہے اور ابھرے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستہ پر لانا ہے، معاشی ناہمواریوں کو درست کرنا ہے۔ زناکاری، شراب خوری قماربازی اور سودی لین دین کے گرم بازاروں کو سرد کرنا ہے، ان تمام بھیانک برائیوں کی سوتیں کو خشک کرنا ہے جو درحقیقت انسانی معاشرے کیلئے تباہ کن ہیں اور جسے معمولی فہم رکھنے والا ہر شخص برا سمجھتا ہے، نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ انسان کو کفر و شرک کی عمیق وادیوں سے نکال کر اسلام کی

کے سوتیلے دادائوں یا ماموؤں کے مکان پر تشریف لائے (یہ راوی کا شک ہے) جو انصار میں سے تھے۔ آپؐ نے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، حالانکہ آپؐ اپنے قبلہ کیلئے بیت اللہ کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ پہلی نماز جو آپؐ نے بیت اللہ کی جانب پڑھی وہ عصر کی نماز ہے۔ اور آپؐ کے ساتھ قوم نے بھی نماز پڑھی۔ پس جن لوگوں نے آپؐ کی ساتھ نماز پڑھی تھی، ان میں سے ایک شخص نکلا اور مسجد قباء والوں پر گذرا اس حال میں کہ وہ لوگ رکوع میں تھے۔ اس شخص نے کہا قسم اللہ کی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی جانب نماز پڑھی ہے، وہ سب لوگ اسی حالت میں مکہ کی طرف گھوم گئے۔ یہود اور اہل کتاب آپؐ کے بیت المقدس کی جانب نماز پڑھنے سے بہت خوش تھے، مگر جب آپؐ نے بیت اللہ کی جانب رخ پھیرا تو ان لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گذری۔ زہیر کہتے ہیں کہ ہم سے حدیث بیان کی ابو اسحاق نے براء سے کہ جو لوگ تحویل قبلہ سے پہلے وفات پاگئے اور شہید کر دئے گئے، ہم نہیں جانتے کہ ان کے حق میں کیا کہیں کہ آیا وہ مسلمان ہیں یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی وما کان اللہ لیضیع ایمانکم الخ۔

یہ تحویلِ قبلہ کی بحث ہے جو کافی اہم ہے۔ مکہ معظمہ جنوب میں اور اس کے شمال میں مدینہ منورہ اور بیت المقدس واقع ہے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہتے ہوئے بھی نماز پڑھتے تھے لیکن اس وقت کا قبلہ کونسا تھا، اس کے متعلق دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ خانہ کعبہ آپؐ کا قبلہ تھا، جب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیت المقدس قبلہ بنایا اور سولہ یا سترہ مہینے کے بعد پھر خانہ کعبہ قبلہ قرار دیا گیا۔ اس قول پر نسخ دو بار لازم آتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہتے ہوئے بھی مامور تھے بیت المقدس کی جانب رخ کرکے عبادت کرنے کے۔ مدینہ میں سولہ یا سترہ مہینے گذرنے کے بعد نسخ قبلہ ہوا ہے اس قول کی بنا پر نسخ صرف ایک بار ہوگا۔ نسخ میں تکرار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں

کہ ہوسکتا ہے یہ لوگ اقامتِ مکہ کے زمانہ میں کعبہ ہی کو قبلہ مانتے ہوں اور کہتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ہی اوّلاً اسکا نسخ ہوا ہے اور پھر سولہ یا سترہ مہینے بعد بیت المقدس کا حکم منسوخ ہوا نسخ کے مکرر ہونیکی یہی صورت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہاں نسخ نہیں ہے بلکہ دراصل مکہ میں بھی قبلہ بیت المقدس ہی تھا مگر مکی زندگی میں بیت المقدس کے استقبال کے وقت خانۂ کعبہ کا استدبار نہیں فرماتے تھے بلکہ اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ دونوں کا استقبال ہوجاتا تھا بایں طور نسخ ایک ہی بار واقع ہوا۔ اب جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے، تو یہاں آکر بڑی پریشانی ہوئی کیونکہ یہاں لازمی طور پر استدبار کعبہ کرنا پڑتا تھا جو آپؐ پر سخت گراں تھا۔ اس لئے آپؐ نے بار بار تحویلِ قبلہ کی دعا مانگی۔ چنانچہ دعا مستجاب ہوئی۔ اسی کو جنابِ باری تعالیٰ فرماتا ہے قد نریٰ تقلب وجہک فی السماء الخ

اَب یہاں چند بحثیں ہیں۔ امام بخاریؒ نے صلوٰۃ کو جزوِ ایمان ثابت کرنا چاہا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جب تحویلِ قبلہ کا امر کیا گیا تو انھیں شبہ ہوا کہ سولہ مہینے تک جو ہم لوگوں نے بیت المقدس کی جانب نمازیں پڑھی ہیں کہیں وہ لغو اور باطل تو نہیں ہوگئیں اس لئے قرآن میں ارشاد فرمایا گیا وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیہا الا لنعلم۔ تو گویا پہلا قبلہ امتحاناً تھا، اس میں اہلِ عرب کی آزمایش تھی کیونکہ انھیں اپنے خاندانی قبلہ یعنی کعبۃ اللہ سے والہانہ عقیدت تھی، بیت المقدس کو قبلہ بنانا ان کی طبیعتوں کے خلاف اور منافی تھا۔ نیز اس حکمتِ عملی میں اہل کتاب کی بھی آزمایش تھی کہ آیا وہ اس توافق کو دیکھکر ایمان لاتے ہیں یا نہیں، اس لئے کہ انکا قبلہ بھی بیت المقدس تھا... تو معلوم ہوا کہ یہ قبلہ محض امتحاناً تھا ورنہ درحقیقت اصل قبلہ کعبہ ہی تھا۔ نیز ایک شبہ یہ بھی تھا کہ اس عرصہ میں جن لوگوں کی وفات ہوگئی ہے ان کی نمازیں غیر معتبر تو نہیں! چنانچہ اس شبہ کے ازالہ کے لئے آیت وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ای صلوٰتکم، نازل ہوئی۔ عند البیت۔ سوال یہ ہے کہ صحابہ کو ان نمازوں کے بارے میں اشکال ہوا تھا جو الیٰ غیر بیت اللہ ہوئی تھیں۔ پس مصنفؒ کو الیٰ غیر بیت اللہ کہنا چاہئے تھا، بعض لوگوں نے اس کو کتابت کی غلطی پر محمول کیا ہے مگر یہ بات کچھ اچھی معلوم نہیں

ہوتی۔معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہاری نمازوں کو ضائع کردیں امر استقبال بیت اللہ کی صورت میں مطلب یہ ہوا کہ استقبالِ بیت خیر محض ہے اس سے کوئی شبہ پیدا نہیں ہوسکتا دوسری توجیہ یہ ہے کہ عندالبیت " صلوٰتکم ہی سے متعلق ہے مگر مراد یہ ہے کہ اقامتِ مکہ کے زمانہ میں خانہ کعبہ کے پاس رہکر جو نمازیں تم نے بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں وہ ضائع نہیں ہوئیں ، وہاں خانہ کعبہ تمہارے سامنے موجود تھا لہٰذا خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کا استقبال ہوتا تھا۔بہت سے آدمی تو وطیرۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق نماز پڑھتے مگر چونکہ محض استقبال بیت المقدس کا حکم تھا اس لئے بعض وہ لوگ جو شمال شرق ومغرب میں رہتے تھے، نمازیں اس طرح پڑھتے تھے کہ خانہ کعبہ کا استقبال نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی نمازیں عندالبیت اور الیٰ غیر الکعبہ ہوتی تھیں۔اس وجہ سے لوگوں کو ان کی نمازوں میں شبہ ہوا۔بخاریؒ واضح طور پر بتلانا چاہتے ہیں کہ جو نمازیں تمہاری خانہ کعبہ کے پاس رہکر بھی الیٰ غیر الکعبہ ہوئی ہیں، جب وہ ضائع نہیں ہوئیں تو، لوگوں کی وہ نمازیں جو خانہ کعبہ سے دور رہکر الیٰ غیر الکعبہ ہوئیں، بدرجہ اَولیٰ ضائع نہیں ہونگی، یہ توجیہ سب سے اچھی اور زیادہ تر مناسب ہے۔

دوسری بحث یہاں ترجمۃ اللباب کی ہے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ایمان سے مراد صلوٰۃ ہے ، اگرچہ یہ معنی مجازی ہیں۔مجاز وحقیقت میں اگر کوئی تعلق نہ ہو تو معنی مجازی نہیں لئے جاسکتے کیونکہ معنی مجازی مراد لینے کیلئے حقیقت ومجاز میں باہمی کوئی نہ کوئی تعلق اور مناسبت ناگزیر ہے۔پس اس بناء پر ایمان وصلوٰۃ میں بھی کسی تعلق کا ہونا ازبس ضروری ہے۔

مصنفؒ کے نزدیک ایمان وصلوٰۃ کے درمیان جزئیت کا علاقہ ہے۔اس لئے کہ الایمان قول و فعل کہا گیا ہے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ جزء ایمان ہے لہٰذا لفظِ ایمان بولکر صلوٰۃ مراد لینا جائز ہوگیا اور اسی سے جزئیتِ صلوٰۃ للایمان ثابت ہوگی اور مدعا بھی یہی تھا۔

حدثنا۔۔۔عمرابن خالد ۔۔۔ علیٰ اجدادہ۔عبدالمطلب کے والد یعنی ہاشم کی شادی مدینہ منورہ میں بنوالنجار کی ایک عورت سے ہوئی شام سے واپسی میں مدینہ اترتے ہوئے۔عبدالمطلب

مدینہ ہی میں پیدا ہوئے۔ ہاشم کی وفات عبد المطلب کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اس لئے عبد المطلب نے مدینہ میں پرورش پائی۔ ہاشم نے مرتے وقت اپنے بھائی مطلب سے کہا کہ تم میرے بیٹے کا خیال رکھنا، اس کی نگہداشت کرنا۔ عبد مناف کے چار بیٹے ہیں مطلب، ہاشم نوفل عبد شمس اول الذکر دونوں ایک ہی ماں سے تھے اور آخر الذکر دوسری ماں سے۔ عبد المطلب کا اصل نام شیبہ ہے۔ یہ جب تک ماں کی تربیت کے محتاج رہے، انھیں مدینہ میں رہنا پڑا اور جب بڑے ہو گئے تو مطلب جا کر ان کو مدینہ سے لے آئے۔ راستے میں لوگوں نے ان کو مطلب کے ساتھ دیکھ کر عبد المطلب عبد المطلب کہا چنانچہ بعد میں یہ عبد المطلب ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

مذکورہ بالا رشتہ داری کی وجہ سے بنو ہاشم کو بنو النجار سے ایک خاص تعلق تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو قباء میں قیام فرما ہوئے اور مسجد قباء کی بنیاد رکھی۔ اقامتِ قباء کی مدت میں مختلف روایتیں ہیں لیکن صحیح تر یہ ہے کہ آپؐ نے چودہ دن قباء میں گذارے اور کلثوم نامی شخص کے یہاں آپؐ کا قیام رہا۔ قباء عوالی مدینہ سے قریب ایک قریہ ہے وہاں جمعہ کا وقت آیا مگر آپؐ نے جمعہ قائم نہیں فرمایا۔ اِنَّ اول جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبد القیس بجواثا من البحرین۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب میں یہی فرمائیں گے کہ قباء سے روانہ ہو کر آپؐ بنو مالک کے محلہ میں تشریف لائے۔ یہاں آکر جمعہ کی نماز ادا کی۔ آپؐ کے آنے سے قبل مدینہ میں جمعہ ہوتا تھا اور امام حضرت ابن زرارہؓ ہوا کرتے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قباء سے روانہ ہوئے تو جس مقام سے آپؐ کی سواری گذرتی وہیں کے لوگ بصد ہزار آرزو و تمنا آپؐ کو دعوتِ اقامت پیش کرتے لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا اس اونٹنی کو چھوڑ دو جہاں یہ از خود بیٹھ جائے گی وہیں ہمارا قیام ہوگا۔ چنانچہ آپؐ کی اونٹنی پہلے بنو النجار کے محلہ میں ٹھہری، اور پھر چل کر ابو ایوب انصاریؓ (جو آپؐ کے اجداد فاسد سے تعلق رکھتے تھے) کے یہاں قیام پذیر ہوئی اسی لئے علیٰ اجدادہ، کہا گیا ہے نیز علیٰ اخوالہ بھی کہنا درست ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ

نے نیچے کے مکان میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا انتظام کر دیا۔ کیونکہ آپ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت بکثرت تھی، اور اپنا سامان اوپر لیگئے۔

رات کے وقت جب آپ سو گئے تو حضرت ابوایوب انصاریؓ کو احساس ہوا کہ ہم اوپر ہیں اور اللہ کا نبی نیچے، ایسا نہ ہو کہ ہمارے پاؤں آپ کے اوپر آجائیں۔ چنانچہ اس خیال سے دونوں میاں بیوی نے لرزتے ہوئے کمرے کے ایک گوشہ میں کھڑے ہو کر رات گذار دی صبح ہوئی تو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہو کر بصد ہزار ادب واحترام عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ رات میں اوپر آرام فرمایا کریں اور ہم نیچے رہا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چھ ماہ تک یہیں قیام رہا۔ اس کے بعد مسجدِ نبوی کی بنیاد رکھی گئی اور آپ ابوایوب انصاریؓ کے مکان سے مسجد میں منتقل ہو گئے۔

ستۃ عشر شھرا۔ بعض لوگوں نے سولہ اور بعض نے سترہ مہینے بتائے ہیں۔ سولہ کہنے والوں نے دخولِ مدینہ کا مہینہ یعنی ربیع الاول کا خیال نہیں کیا اس لئے سولہ مہینے کہا ہے۔ وکان یعجبہ ان تکون قبلتہ قبل البیت۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ بتائی گئی ہے کہ وہ قبلہ ابراہیمیہ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی مناسبت تھی۔ چنانچہ بیان حلیہ میں بھی آپ نے خود کو ابراہیم علیہ السلام کے ہم شکل بتایا ہے۔ اشبہ صاحبکم بابراہیم۔

اور روحانیت میں بھی باہمی قرابت تھی۔ ان اولی الناس بابراہیم للذین اتبعوہ وہذا النبی الخ دوسری وجہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدائشی وطن مکہ ہے اور قدرتی طور پر اپنے وطن سے گہری محبت ہوتی ہے، وطن کی ایک ایک چیز محبوب ہوتی ہے، تو گویا آپ طبعی طور پر اسے محبوب رکھتے تھے۔

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحاں بہتر

تیسری وجہ یہ ہے کہ قریش اور تمام اہلِ عرب کو بیت اللہ سے والہانہ عقیدت تھی۔ جوتی

وجہ یہ ہے کہ اشرف بقعۃ فی الارض ارض الکعبہ۔ ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا
پانچویں وجہ یہ ہے کہ حقیقتِ کعبہ اور حقیقتِ محمدیہ میں وہی مناسبت ہے جو اصل و
نقل میں ہوتی ہے، عالمِ روحانیت میں حقیقتِ محمدیہ اصل کی حیثیت رکھتی ہے، مظہرِ تجلی اوّل
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور مظہر تجلی عکس اوّل کعبۃ اللہ۔ اسی وجہ سے تمام موجودات
میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ مناسبت کعبہ سے ہے۔
دراصل یہ چیز آپ کے سمجھنے کی نہیں ہے، اس کو پوری طرح نہ ہم سمجھا سکتے ہیں اور نہ آپ
لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اور اگر شوق ہے تو دیکھئے قبلہ نما، اور آب حیات۔

وانہ صلیٰ اوّل صلوٰۃ صلّاہا صلوٰۃ العصر۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم بعد الظہر اور قبل العصر نازل ہوا
ہے۔ بعضوں نے کہا کہ اس حکم کا نزول عین نماز ظہر میں ہوا ہے۔ مگر پہلا خیال صحیح تر ہے۔

فخرج رجل۔ وہو عباد بن نہیک۔ یہ مسجد سلمہ میں پہنچا وہاں لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس کی اطلاع
پر وہ لوگ کعبہ کی طرف گھوم گئے اس مسجد کو مسجدِ ذوقبلتین کہتے ہیں، یہاں پر اشکال ہوتا ہے
کہ ان لوگوں نے اس شخص کی خبر پر جو کہ خبر واحد تھی آخر کیسے یقین کر لیا جبکہ خبرِ واحد مفید یقین
نہیں ہوتی؛ دوسری جانب بیت المقدس کا قبلہ ہونا قطعی اور یقینی تھا۔ پس سوال ہے کہ
انہوں نے خبر واحد کے ذریعہ علم یقینی کو کیونکر منسوخ مان لیا؟ جواب یہ ہے کہ ہم اس بات
کو تسلیم نہیں کرتے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں ہوتی۔ یہ حکم تو اس وقت ہوتا ہے جبکہ قرائن موجود نہ
ہوں لیکن اگر قرائن موجود ہوں تو اس وقت یہ حکم نہیں ہوتا۔ الخبر المحفوف بالقرائن یفید العلم۔
اگر ایک آدمی تنہا آکر موتِ سلطان کی اطلاع دے اور شاہی قلعہ پر جھنڈا سرنگوں دیکھا جائے
تو بہر حال اس تنہا شخص کی خبر مفید یقین ہوگی۔ لوگوں کو اس بات کا علم پہلے سے تھا کہ آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم تحویل قبلہ کے لئے دعا فرما رہے ہیں اور آپ سے عنقریب تبدیلی قبلہ کا وعدہ بھی فرما
لیا گیا ہے۔ سو اس قرینہ کی وجہ سے یہ خبر واحد مفید علم ویقین ہو گئی۔ واہل الکتاب۔ یہ عطفِ عام
علی الخاص ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ ممکن ہے اہل کتاب سے خاص

طور پر نصاریٰ مراد ہوں۔ سوال ہوتا ہے کہ نصاریٰ کو اس سے خوشی کیوں ہوئی، جبکہ ان کا قبلہ بیت اللحم تھا، جواب یہ ہے کہ ان کے یہاں توراۃ بھی حجت ہے۔ اس شارکت کی وجہ سے انھیں مسرت ہوئی۔ انہ مات علی القبلۃ قبل ان تحول۔ یہاں سوال یہ ہے کہ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اندر امتِ محمدیہ کی تعلیم وتربیت رفتہ رفتہ ہوئی ہے۔ بیک وقت سارے احکام نہیں اتار دئے گئے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ہوا تھا۔ اس تدریجی تربیت کی وجہ سے مختلف بار نسخ واقع ہوا ہے۔۔۔ اور نسخ کے واقعات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے متعدد مرتبہ پیش آچکے تھے اور جب نسخ ہوا تو اولاً اشکال نہیں ہونا چاہئے اور اگر ہوا ہی تو محض دو ہی چیزوں میں کیوں واقع ہوا؟۔۔۔ ان دو چیزوں میں سے ایک تو یہی تحویلِ قبلہ ہے اور دوسری شے ہے تحریم خمر۔ اس کے متعلق بھی یہی شبہ ہوا تھا کہ جو لوگ مر گئے ہیں انکا کیا ہوگا، بہرحال تحریم خمر سے متعلق جواب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے شراب کی بابت سوالات کئے۔ حضرت عمر اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کو حرام ہونا چاہئے۔ اس کی حرمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آیت ویسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیہما اثم کبیر ومنافع للناس الخ نازل فرمائی مگر چونکہ اس سے بصراحت حرمتِ خمر ثابت نہیں ہوئی اس وجہ سے عام طور پر لوگوں نے شراب کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت عبدالرحمٰن کی ایک دعوت میں کھانے کے بعد پیمانوں کا دور چلا۔ حضرت علیؓ بھی اس مجلس میں شریک تھے اسی حالت میں مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ حضرت علیؓ نے اور بعض روایات کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے نماز پڑھائی۔ غلبۂ سُکر کی وجہ سے بجائے لا اعبد ما تعبدون کے اعبد ما تعبدون، پڑھ گئے۔ اس پر حق تعالیٰ نے آیت یاایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سُکریٰ الخ نازل فرمائی جس کا مطلب یہ ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی جانا ممنوع ہے۔

آیت مذکورہ سے بھی چونکہ صراحۃً شراب کی حرمت دریافت نہیں ہوتی، اس لئے لوگ کہتے تھے کہ ہمیں شراب پی کر نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے نہ کہ مطلق شراب سے، خارجِ صلوٰۃ ہمیں

شراب پی نے کی اجازت ہے، مگر جو لوگ اہلِ دانش تھے معاملہ فہم اور نکتہ رس تھے وہ بھانپ گئے کہ عند اللہ شراب مبغوض ہے حضرت عمرؓ نے جب لوگوں کو شراب پی تے اور آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے سنا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ اسے حرام ہی فرمادیں چنانچہ اس کی حرمت کیلئے تیسری آیت یاایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون. انما یرید الشیطان ان یوقع الخ نازل ہوئی جس میں شراب کو رجس کہا گیا اور یہ بھی فرمایا گیا کہ یہ تمہیں ذکر اللہ نماز اور دوسرے امور خیر سے روکتی ہے۔ اس صراحت کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے ہی شراب ترک کردی۔ تو جن لوگوں نے پہلی اور دوسری آیت سے شراب نہیں چھوڑی تھی ان کی بابت یہاں سوال کیا گیا۔ اسی طرح تحویلِ قبلہ میں باری تعالےٰ فرماتا ہے وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیہا الا لنعلم من یتبع الرسول۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیت المقدس اصل قبلہ نہیں تھا بلکہ امتحاناً تھا۔ امتحان اسی چیز کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو نفس کی خلاف ہو اعام عرب پر یہ اس وجہ سے شاق اور گراں تھا کہ ان کا کعبہ جو ان کے جد اعلیٰ کا بنایا ہوا تھا اس سے رخ موڑ کر انہیں بیت المقدس کی جانب نماز پڑھنے کا حکم کیا گیا تھا۔ اور تحویلِ قبلہ یہود کے نفس کے یوں خلاف تھا کہ ان کا سابق قبلہ بیت المقدس تھا۔ تو بہر حال مسلمانوں کو شبہ ہوا کہ ہماری گذشتہ نمازیں کیسے مقبول ہوں گی، چنانچہ اس کا جواب دیدیا گیا۔

یہاں اگر کوئی یہ کہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے، صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق اور معبود حقیقی ہے، اور استقبال قبلہ میں عبادت اس مقام کی ہوتی ہے جس کی جانب رخ کیا جاتا ہے، چاہے وہ بیت المقدس ہو اور چاہے خانہ کعبہ۔ بہر حال اس مسئلہ میں عبادت غیر اللہ کی لازم آتی ہے؟

جواب میں کہدو کہ انسان کے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم دوسری روح۔ روح متوجہ الی اللہ ہونے ..... کے لئے کسی جہت کی بالکل محتاج نہیں لیکن جسم عبادت کیلئے کسی نہ کسی

جہت کا متقاضی ہے۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو عبادتِ جسمانی کے واسطے کسی جہت کو متعین نہ کیا جائے بلکہ ہر شخص کو اجازت عامہ ہو کہ جدھر کو اس کا دل چاہے وہ عبادت کر لیا کرے اور دوسری صورت یہ ہے کہ عبادت کے لئے کسی خاص جہت کی تعیین کی جائے۔

پہلی صورت میں زبردست پیمانہ پر باہمی اختلاف وانتشار رونما ہو گا، دین میں انفرادیت دخل پائے گی جو اسلام کی روح کے قطعی خلاف ہے۔ اسلام فطری طور سے نہ صرف یہ کہ اجتماعیت کا حامی ہے بلکہ عظیم ترین داعی بھی۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا۔ پھر وہ انفرادیت کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ بایں ہمہ ضروری ہے کہ کسی خاص جہت کو متعین کیا جائے۔

یہ واضح رہے کہ جہت مسجود لہٗ نہیں ہے، مسجود الیہ ہے جس کے بغیر چارۂ کار ہی نہیں۔ اور مسجود الیہ کا غیر اللہ ہونا خلاف توحید نہیں اور پھر یہ کہ مسجود الیہ دیوارِ کعبہ نہیں ہے ورنہ انہدام کے بعد اس طرف نماز جائز نہ ہونی چاہیے حالانکہ نماز قطعًا جائز رہتی ہے، بلکہ مسجود الیہ بُعدِ مجرد ہے۔

باب حسن اسلام المرء حدثنا ۔۔۔ ابوہریرہؓ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارے میں سے کسی نے اپنا اسلام سنوارا، اپنے دین کو مہذب بنایا، اب جو نیکی کرے گا تو دس گنی لکھی جائے گی سات سو تک۔ اور جو بدی عمل میں آئے گی وہ اتنی ہی لکھی جائے گی۔

اذا اسلم العبد فحسن اسلامہ۔ اسلام اور حسنِ اسلام کے اندر فرق ہے۔ حسنِ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے قلب کو شکوک وشبہات سے خالی کر لیا، ہبراء کر لیا۔ یا یہ کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لایا۔ یا یہ کہ اعمالِ صالحہ کئے، برائیوں سے بچا۔ اسلام کی حدود میں داخل ہونے کے بعد زمانہ کفر وشرک کے تمام گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں اور یہاں سے اسکا محاسبہ شروع ہوتا ہے یعنی اس سے اب اگر کوئی گناہ سرزد ہو گا تو اس کی سزا دی جائے گی البتہ گناہِ صغیرہ اعمال صالحہ سے بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص کھجور خریدنے کیلئے دوکان پر گئے، مگر

اتفاق سے دوکان پر عورت بیٹھی ہوئی تھی، سامنے رکھی ہوئی کھجوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کیا تمہارے پاس اس سے بھی عمدہ کھجوریں ہیں؟ عورت نے جواب دیا ہاں اندر رکھی ہیں یہ صاحب دوکان کے اندر گئے تو شیطانی اثرات نے انھیں گھیر لیا، زنا کے علاوہ باقی تمام ہی حرکات کے مرتکب ہوئے۔ بعد کو ندامت ہوئی تو سرکار دوعالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بے پناہ شرمندگی کے ساتھ پورا واقعہ عرض کیا۔ آپؐ جواب دئے بغیر عصر کی نماز کیلئے تشریف لیگئے۔ نماز سے فراغت کے بعد صحابی نے پھر وہی واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ عرض کیا پڑھی ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا نماز اور دوسرے اعمالِ صالحہ سے صغائر معاف ہوجاتے ہیں۔

حدثنا اسحاق بن منصور... اس روایت اور گذشتہ روایت سے معلوم ہوا کہ بعض اسلام حسن اور بعض غیر حسن ہوتا ہے پس اس سے اسلام میں زیاتی و نقص رجوا امام بخاریؒ کا مقصد تھا ثابت ہوگیا۔ باب احب الدین الی اللہ الخ حدثنا... حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں تشریف لائے میرے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی آپؐ نے فرمایا کون ہے۔ میں نے کہا فلاں ہے جس کی نماز کا چرچا کیا جاتا ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا بند کرو اور اس شے کا التزام کرو جس کی تمہارے اندر قوت ہو۔ قسم ہے اللہ کی وہ ثواب دینے میں تنگ نہیں ہوتا لیکن تم عمل کرنے میں تنگ ہوتے ہو؟

احب" یہ اسم تفضیل للمفعولیہ ہے ای اشد محبوباً۔ ادوم دوام کا اسم تفضیل ہے اور دوام تمام زمانوں کو شامل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جسکا شمول جمیع ازمنہ پر ہوتا ہے وہ زیادتی کو قبول نہیں کرتا؟۔ جواب یہ ہے کہ اس جگہ دوام سے دوامِ عرفی عبارت ہے۔ جس میں کمی و زیادتی ممکن ہے لایمل اللہ حتی تملوا۔ بفتح المیم فی الموضعین والملال استثقال الشئی ونفور النفس عنہ بعد محبتہ وھو محال علی اللہ تعالیٰ باتفاق۔ قال الاسماعیلی وجماعۃ من المحققین انما اطلق ہذا علیٰ جہت المقابلۃ اللفظیۃ مجازا کما قال اللہ تعالیٰ وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا الخ۔ باب زیادۃ الایمان ونقصانہ۔ حدثنا... حضرت

انسؓ آپؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا جس نے لاالٰہ الااللہ کہا اور اس کے قلب میں ایک جو کے برابر نیکی ہوئی وہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ اور وہ بھی دوزخ میں نہیں رہے گا جس نے لاالٰہ الااللہ کہا اور اس کے قلب میں ایک ذرہ کے برابر نیکی ہوئی۔ طارق ابن شہاب عمرابن الخطاب سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ان سے کہا اے امیرالمومنین ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے تم اس کو پڑھتے ہو اگر وہ ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن مقرر کرتے۔ حضرت عمر نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے؟ یہودی نے کہا الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً۔ حضرت عمر نے فرمایا ہمیں وہ دن اور وہ مکان یاد ہے کہ جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آنحضور علیہ السلام عرفہ میں قیام فرما تھے اور جمعہ کا دن تھا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک عید کو کہہ رہے ہمارے لئے دو عیدیں ہیں۔ ایک عرفہ دوسرا جمعہ۔ زیادتِ ایمان اور نقصِ ایمان کو مصنفؒ پہلے بیان کر چکے ہیں مگر وہاں جزئیتِ عمل کی وجہ زیادتی اور نقصِ ایمان کو بتلایا تھا پھر بسبب علم کے زیادۃ ونقصان کو بتایا۔ انا اعلم۔ اور اب زیادتی وکمی باعتبار مومن بہ کے بتلا رہے ہیں کہ کبھی العلم بمعنی المعلوم بولا کرتے ہیں یہاں بھی اسی حیثیت سے ایمان ملحوظ ہے۔ اس باب کے اندر اوّلاً بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قول اللہ وزدناہم ہدیٰ، پیش کیا اور پھر وقال، الیوم اکملت لکم دینکم" فرمایا۔ مصنفؒ کے پہلے اور دوسرے طرز میں اختلاف ہوگیا پہلے وقول اللہ اور بعد میں وقال اللہ کہا، اس کی کیا وجہ ہے؛ سنئے پہلی آیت میں زیادت کے الفاظ صراحتہ پائے گئے تھے اس لئے گویا جزوی بات تھی اور دوسری آیت کے اندر اکمال کا لفظ تھا، اس سے اگرچہ زیادۃ ونقص کا ثبوت تو ہوگیا مگر ضمناً۔ اس وجہ سے اس کو دوسرے عنوان سے بیان کیا الیوم اکملت لکم دینکم الخ فرمایا گیا کہ اب تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا گیا یعنی تمام مومن بہ کا نزول ہوگیا، مگر یہاں اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ قبل الاکمال ظاہر ہے کہ شے ناقص ہوتی ہے پس قبل حجۃ الوداع

یعنی آیت کے نازل ہونے سے پہلے دین وایمان کا ناقص ہونا لازم آتا ہے۔ جو لوگ حجۃ الوداع سے قبل داعیٔ اجل کی آواز پر لبیک کہہ چکے ہیں وہ گویا مومن کامل نہیں ہیں؟
جواب یہ ہے کہ یہ نقصان تو ضرور ہے لیکن نقصانِ اضافی ہے ورنہ حقیقت میں ان لوگوں کا نفسِ ایمان بہرحال کامل ہے ہاں مومن بہ کی کمی کی وجہ سے ایمان کے اندر بھی اضافی کمی ہو گی اور مُضر جو ہے وہ نفس ایمان کی کمی ہے۔ ایمانِ اضافی میں نقص کسی طرح مضرت رساں نہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ انبیاء علیہم السلام کی شرائع کو نامکمل وناقص کہدیا جائے اور شریعتِ محمدیہ کو تام اور کامل بلاشبہ شریعتِ موسوی یا عیسوی بجائے خود کامل شریعتیں تھیں مگر شریعت محمدیہ کے اعتبار سے نامکمل وغیر تام اور ظاہر ہے کہ اس سے کسی قسم کی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ حدثنا مسلم بن ابراہیم قال حدثنا ہشام قال حدثنا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ محض لاالہ الا اللہ کہدینا خروج من النار کیلئے کافی ہے۔ حالانکہ خروج من النار کے واسطے رسالت پر یقین رکھنا اور اس کا اقرار کرنا بھی ناگزیر ہے پس اس جملہ کی تصیح کس طرح ہو گی؟ جواب یہ ہے کہ لاالٰہ الا اللہ کنایہ ہے تمام کلمۂ توحید سے۔ جیسے کہا جائے جس نے قل ہو اللہ پڑھ لی اس کو اتنا ثواب ملیگا۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ صرف قل ہو اللہ کے الفاظ پڑھے، بلکہ پوری سورت کا پڑھنا مقصود ہوتا ہے۔ اس باب کو باب الاکتفا کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں احد المعطوفین کے ذکر کو کافی سمجھا گیا ہے جیسے تقیکم الحر میں البرد بھی محذوف ہے، نیز رب المشارق سے رب المغارب بھی مراد ہے۔ اسی طرح روایتِ مذکورہ میں کلمۂ رسالت بھی داخل ہے۔ وزن شعیرۃ من خیر۔ ظاہر ہے کہ محض خیر کا ہونا کافی نہیں بلکہ دخولِ جنت کے لئے ایمان ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ ترجمہ میں زیادتِ ایمان اور نقصِ ایمان ثابت کرنا ہے۔ "خیر" مبحوث عنہ نہیں ہے اس لئے ترجمہ میں موافقت نہیں رہیگی؛ اس اشکال کے لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے طریقہ سے بتایا کہ یہاں روایت بالمعنی ہے اور اصل مقصد ایمان ہے جیسا کہ ابان عن قتادہؓ عن انسؓ کی سند سے معلوم ہوتا ہے۔ اب ترجمۃ الباب سے مطابق ہو جاتی ہے۔ یہاں ایمان کو مادیات سے تشبیہ دی۔

گئی ہے کیونکہ اوزان مادیات ہی کے لئے ہوتے ہیں، شئے روحانی کیلئے وزن شعیر یا کسی اور وزن کے ثبوت کے کوئی معنی نہیں پس یہاں اس کا ثبوت کیوں کیا گیا؟
جواب یہ ہے کہ یہ قبیل تشبیہ المعقول بالمحسوس سے ہے۔ ذرہ کی تفسیر بعض لوگوں نے چھوٹی چیونٹی سے کی ہے اور بعض لوگوں نے ذرہ الھبا کو کہا ہے ھبا، ان ذرات کو کہتے ہیں کہ جو آفتاب کی شعاعوں میں چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

الیوم اکملت لکم الخ سے ایک مسئلہ یہ بھی نکلتا ہے کہ بدعات کا ماننے والا قرآن کی اس آیت کا منکر ہے گویا وہ اب بھی تکمیل دین کا قائل نہیں۔ میلاد کی پابندی، گیارہویں، اور تعزیہ داری وغیرہ سب اس کی نظیریں ہیں۔

"باب الزکوٰۃ من الاسلام و قولہ تعالیٰ وما امروا الخ۔ حدثنا .... ابی سہیل ابن مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے طلحہ ابن عبید اللہ سے سنا وہ کہتے ہیں کہ اہلِ نجد میں سے ایک شخص پراگندہ بال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سنتے تھے مگر وہ کہتا کیا ہے یہ نہیں سمجھتے تھے یہانتک کہ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگیا پس معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے احکام و فرائض دریافت کرنا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ نمازیں رات و دن میں (فرض) ہیں۔ اس نے پوچھا ان پانچ کے علاوہ کیا میرے اوپر اور بھی نماز فرض ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں مگر نفل پڑھنا۔ آپ نے فرمایا اور رمضان کے روزے رکھنا؛ اس نے پوچھا میرے اوپر اس کے علاوہ اور بھی روزہ فرض ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ نہیں مگر نفلی روزہ۔ راوی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے زکات کا ذکر فرمایا۔ اس نے پوچھا کیا زکات کے سوا بھی دینا میرے اوپر فرض ہے آپ نے فرمایا نہیں، مگر بطورِ نفل دینا۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد وہ شخص

واپس جانے لگا درانحالیکہ کہتا جاتا تھا قسم اللہ کی اس پر نہ زیادہ کروں گا
اور نہ کم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فلاح پائی اس شخص نے اگر یہ سچا ہے۔
زکات من الاسلام کے ثبوت کیلئے مصنفؒ نے مذکورہ بالا آیت پیش کی ہے جس کے اندر
یؤتوا الزکوٰۃ آیا ہے اور آگے فرمایا ذالک دین القیمہ۔ معلوم ہوا کہ زکات دین ہے اور اسلام
کا جزء ہے۔ وثائر الرأس۔ یعنی اس شخص کے سر کے بال پراگندہ ومنتشر تھے یہ بعد سفر کا نتیجہ تھا
غالباً یہ واقعہ ضمام ابن ثعلبہ کا ہے۔ بہرحال انھوں نے دور ہی سے پکارنا شروع کیا مگر الفاظ
کچھ سمجھ میں نہیں آتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ حتیٰ دنا۔ اب جبکہ وہ قریب آگئے تو معلوم ہوا کہ اسلام
کی بابت دریافت کر رہے ہیں اور مقصد حقیقتِ اسلام کو پوچھنا نہیں بلکہ شرائع اسلام کو
پوچھنا ہے، اسی لئے جواب میں شرائع کو ذکر فرمایا گیا۔ الاأن تطوع سے شوافع حنفیہ کے
خلاف استدلال پیش کرتے ہیں کہتے ہیں کہ وتر اور صلوٰۃ عید الفطر کو واجب قرار نہ دینا چاہیے
اگرچہ خود امام شافعیؒ کا ایک قول فرضیتِ وتر کا ہے لیکن تاہم جواب یہ ہے کہ جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس فرض کی زیادتی سے منع کیا جس کی کیفیت فرضیتِ صلوٰۃ خمسہ
کی طرح ہو پس یہاں انکارِ فرضیت ہے، انکار واجب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ابوداؤد میں
آتا ہے الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا۔ دوسری جگہ ہے ان اللہ امدکم بصلوٰۃ الا وہی الوتر۔ فاوتروا
یا اہل القرآن، ان روایات سے اس کی فرضیت مفہوم ہوتی ہے اور زیر بحث روایت سے
عدم فرضیت، اس لئے ضروری ہو کہ تطبیق دی جائے یا تاویل کی جائے یا ترجیح کی کوئی صورت
نکالی جائے۔ تو اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ ہذا القول قبل شروعیۃ الوتر۔ دوسری صورت
ہے المقصود ھہنا بیان فرائض المستقلہ والوتر تابع لصلوٰۃ العشاء۔ تیسری صورت ہے المقصود
من النفی نفی الفرضیۃ بحیث یکفر جاہدہا واثبات الوجوب الذی لایکفر جاہدہا۔
الاأن تطوع کے معنی پر ایک بحث پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ مالکیہ اور حنفیہ شروع فی النفل کے بعد
اس کو واجب قرار دیتے ہیں اب اگر کوئی اس کو چھوڑ دے تو قضا واجب ہوگی یہی حال

حج اور صوم کا بھی ہے۔ شوافع اور حنابلہ شروع کو موجب نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں ان شاءَ قضاء ما ترک وان شاء یترک۔ صوم میں بھی اسی کے قائل ہیں۔ البتہ حج کے اندر وہ حضرات اسباب کے قائل نہیں بلکہ اس کو فرض قرار دیتے ہیں، کہتے ہیں واتموا الحج والعمرۃ للّٰہ فرمایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دخول کے بعد اتمام ضروری ہے، اس لئے قضا واجب ہوگی، مگر نماز و روزہ میں یہ بات نہیں ہے، بہرحال شوافع رحمہم اللہ الا اَن تطوع سے استدلال کرتے ہیں کہ لیس بواجب علیک شیئ الا انہ یستحب علیک الاکمال بعد الشروع فیہما پس یہ استثناء متصل ہوگا جو اصل ہے۔ اور شوافع و حنابلہ کے قول کے مطابق اگر مانا جائے تو یہ استثنا استثنائے منقطع ہوگا جو خلاف اصل ہے۔ لا ازید ولا انقص ہذا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تائید فرماتے ہیں کہ افلح ان صدق، صدق کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی بھی نکرے۔ حالانکہ زیادتی میں فائدہ ہی فائدہ ہے، نقصان نہیں؛ یہ صحیح ہے لیکن لا ازید باعتبار اخبار کے ہے یعنی اپنی قوم تک لفظ بہ لفظ پہنچا دوں گا اس میں نہ کسی قسم کی زیادتی کرونگا اور نہ کمی۔ معلوم ہوا کہ لا ازید عمل کیلئے نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صدق کی طرف راجح عمل ہی ہے مگر عدم فلاح بہ سبب الزیادۃ، یہ مفہوم مخالف معتبر نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ زیادۃ ونقص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ظہر میں پانچ رکعت نماز پڑھے اور مغرب میں دو رکعت، تو مراد یہ ہوا کہ لا ازید فی اعداد الفرائض ولا انقص۔ اب کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیئے۔

باب اتباع الجنائز من الایمان۔ حدثنا... ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور ثواب حاصل کرنے کی غرض سے میت کے ساتھ رہے جبتک کہ نماز جنازہ نہ پڑھ لی جائے اور اس کے دفن سے فراغت نہ پائی جائے پس بلاشبہ وہ شخص لوٹتا ہے دو قیراط اجر لیکر (ہر قیراط اُحد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے) اور جس شخص نے نماز جنازہ پڑہی پھر دفن سے پہلے لوٹ آیا پس یہ ایک قیراط کے

برابر ثواب لیکر لوٹا۔

جَنازہ بفتح الجیم وبکسرہا۔ جنازہ بفتح الجیم کے معنی لاش کے ہیں اور بکسر الجیم کے معنی سریر کے جس پر لاش رکھی جاتی ہے۔ بعضوں نے اس کے برعکس کہا ہے اور بعضوں نے دونوں کو مرادف قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ یہاں یہ بتا رہے ہیں کہ جنازے کے پیچھے چلنا بھی ایمان کے اندر داخل ہے

مسئلہ مشی خلف الجنازہ | اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ جو لوگ جنازہ کی مشایعت کو جاتے ہیں وہ جنازے کے آگے چلیں یا پیچھے؟ حاملینِ جنازہ کیلئے کوئی دفع مخصوص نہیں مگر مشایعین کے بارے میں گفتگو ہے کہ ان کا آگے چلنا افضل ہے یا پیچھے چلنا۔ امام ابوحنیفہؒ پیچھے چلنے کو افضل کہتے ہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک فضیلت آگے چلنے میں ہے۔ ہر دونوں بزرگوں کے پاس اپنے اپنے مذہب کے ثبوت میں روایات بھی ہیں اور عقلی دلائل بھی۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں ساتھ چلنے والے گویا کہ سفارشی ہیں، شفاعتِ میت کیلئے جا رہے ہیں اور شافع کو آگے ہی رہنا چاہیئے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ وہ مردہ شخص موت سے پہلے مجرم رہا ہوگا مگر اب وہ ہمارے لئے ہدیہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہمیں بارگاہ خداوندی میں پیش کرنا۔ لہٰذا ہدیہ کے احترام کی خاطر اسے (ہدیہ کو) آگے اور مشایعین کو پیچھے ہی رہنا چاہیئے، نعش کے احترام ہی کی وجہ سے پہلے میت کو نہلایا جاتا ہے، اچھے اور نئے ملبوس کا انتظام کیا جاتا ہے، عطر لبایا جاتا ہے اور نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے اور پھر اسے لیکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں، گویا کہ ہم ایک موحد کو جناب حق تعالیٰ کے حضور میں ندرانہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جیسے شہنشاہ کے حضور میں عمدہ خوان بطور نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ ورنہ اگر حقیقت میں یہ بات نہ ہوتی بلکہ شوافع رحمہم اللہ کے قول کے بموجب دراصل سفارش ہی مقصود ہوتی تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ میت کو اس طرح نہلانا، خوشبو لگانا، عمدہ کپڑے پہنانا وغیرہ اس قدر اہتمام کہیں مجرم کیلئے کیا جاتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ دعا کے اندر اس کیلئے کوئی مخصوص شئے نہیں ہوتی جس سے سفارش کا اظہار ہوتا ہو بلکہ مطلقاً تمام مسلمانوں کے لئے دعا کی جاتی ہے، اگر واقعتہً

اس کی پوزیشن سفارش طلب کی ہے تو ضرور اس کیلئے کوئی مخصوص دعا ہونی چاہیئے۔ نیز اس کو زیادہ سے زیادہ گری ہوئی حالت میں پیش کیا جانا چاہیئے! کیوں؟ اس لئے کہ مغلوک الحال زیادہ قابل رحم ہوتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ مَن اتبع الجنازہ بھی مذہب امام ابو حنیفہؒ کی تائید کرتے ہیں اور روایت کی قوت مسلّم ہے۔ ترمذی اور ابو داؤد کی روایت جس سے مشئ امام الجنازہ، مفہوم ہوتی ہے، روایت فعلی ہے اور یہ روایت قولی۔ کل قیراط۔ یہاں شبہ ہوتا ہے کہ قیراط کو ذکر کیا گیا حالاں کہ وہ ایک معمولی سی مقدار ہے۔ اس شبہ کو دفع کرنے کیلئے کہا گیا کہ وہ اُحد کے برابر ہے۔ اور احد کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ عموماً پہاڑ ونکا ایک سلسلہ ہوتا ہے مگر احد مستقل ایک پہاڑ ہے۔ بہر حال روایت سے معلوم ہوا کہ اجر میں کمی بیشی ہوتی ہے اور وہ ایمان کا جزء ہے اس لئے ایمان میں بھی کمی بیشی پائی گئی اور اس سے مصنفؒ کا دعویٰ الایمان یزید وینقص، ثابت ہو گیا۔

باب خوف المومن ان یحبط عملہ وہو لا یشعر۔ ابراہیم تیمی نے فرمایا میں اپنا قول اپنے عمل پر پیش نہیں کرتا مگر اس بات کا خوف محسوس کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جھوٹے میں مبتلا کرنے والا نہ ہوں۔ ابن ملیکہ نے فرمایا میں نے آنحضرتؐ کے تیس اصحاب سے ملاقات کی وہ سب نفاق فی العمل کا خوف محسوس کرتے تھے ان میں سے کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبریل ومیکائیل کے ایمان کے مانند ہے۔ حسن بصری سے ذکر کیا جاتا ہے کہ نفاق سے کوئی خائف نہیں رہتا مگر مومن اور نہیں بیفکر رہتا اس سے مگر منافق اور اس بیان میں کہ نہیں بچ سکتا قتل ونافرمانی پر اصرار کرنے سے سوائے توبہ کے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ولم یصروا علیٰ ما فعلوا وہم یعلمون۔ حدثنا۔۔۔ زبید سے مروی ہے کہ میں نے ابا وائل سے مرجیہ کے بارے میں سوال کیا انھوں نے کہا کہ مجھ سے عبد اللہ نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر۔ انسؓ سے روایت ہے کہ مجھے ابن صامت نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو "لیلۃ القدر" کی اطلاع دینے کے لئے باہر تشریف لائے۔ دو مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے درمیان اٹھکر، آپ نے فرمایا میں لیلۃ القدر کی تم لوگوں کو خبر دینے کے لئے

نکلا تھا۔ فلاں فلاں آدمی جھگڑ رہے تھے۔ میرے ذہن سے وہ رات بھلا دی گئی
اور یہ بھولنا شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔ تم اس کو ستائیسویں، انتیسویں اور
اور پچیسویں شب میں تلاش کرو۔

مرجیہ و کرامیہ کے نزدیک ایمان صرف لاالٰہ الّا اللہ کا نام ہے، عمل کو اس کے اندر کوئی دخل نہیں پس مسلمان ہر قسم کی بھیانک برائیوں کے باوجود بھی مومن کامل ہی رہیگا۔ مصنف تبلانا چاہتے ہیں کہ تمہارا ایمان ہمہ وقت خطرہ میں ہے کوئی ٹھکانا نہیں کہ کب تم نفاق کی تاریک وادیوں میں جا پڑو، کبائر کے مرتکب ہو جاؤ۔ اور تمہارا ایمان ایمانِ کامل نہ رہے۔ بایں ہمہ تم ہرگز ایمانی کا ایمانِ جبریل علیہ کہنے کے مجاز نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جبریل علیہ السلام کے ایمان میں اختلاط نفاق کا کوئی اندیشہ نہیں۔ قال ابراہیم تیمی الخ یہ کبائر تابعین میں سے ہیں، بڑے درجے کے عالم ہیں کہتے ہیں جب میں اپنے علم کو اپنے عمل پر پیش کرتا ہوں، تو ڈرتا ہوں کہ مکذّب ہو جاؤں۔ اَو بفتح الذال یعنی میں جس بات کی لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں، خود اس پر عامل نہیں ہوں، لوگ تکذیب کرنے لگیں کہ قیام لیل کی دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور آپ عمل نہیں کرتا۔

ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں بہت سے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا مگر سب کے سب نفاق فی العمل سے ڈرتے رہتے، مرجیہ کی طرح بے خوف نہیں تھے۔ متکلمین ماتریدیہ انا مومن حق اور ایمانی کایمان جبریل۔ کہنا جائز کہتے ہیں جبکہ ایمان سے مراد نفس تصدیق ہو۔ کیونکہ نفسِ تصدیق میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ خود امام صاحب نے مثل ایمانِ جبریل کہنے کی جرأت نہیں کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کیفیات میں اشتراک ضروری ہے اور واقعہ ایسا ہے نہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آمنت علیٰ ما آمن بہ جبریل علیہ السلام، معلوم ہوا کہ مومن بہ میں اشتراک ہے۔ سباب العلم فسوق وقتالہ کفر۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاصی ایمان کے اندر مضر ہیں۔ بدینوجہ مرجیہ و کرامیہ کا یہ کہنا کہ اعمال کو ایمان کے اندر کوئی دخل نہیں قطعاً غلط اور سراسر بے بنیاد ہے۔ قتالہ ای فعل الکفر۔ یہ اس لئے کہ کفر میں داخل ہونا حقیقتہً نہیں ہے

دوسری توجیہ ہے کفراذا کان نیتہ استحلالہ تیسری توجیہ ہے قتالہ کفر، آپؐ نے ڈرانے کے لئے فرمایا ہے، لیکن مطمئن رہنا درست نہیں۔ اب ترجمہ صحیح وثابت ہوگیا۔ خرج یخبر بلیلۃ القدر۔ آپؐ کو لیلۃ القدر کی تاریخ بتلائی گئی تھی، آپؐ لوگوں کو خوشخبری سنانے کیلئے تشریف لائے، راستہ میں دیکھا کہ دو صحابی آپس میں جھگڑ رہے ہیں، آپؐ ان میں صلح کرانے لگے۔ اس اثناء میں تاریخ معینہ کا علم آپ کے ذہن مبارک سے نکل گیا۔ دیکھیے معاصی کا ہونا اس قدر منحوس ہے کہ حفظ نبی پر بھی اس کا اثر پڑا اور ہم بہت بڑی نعمت سے محروم ہوگئے۔ شیعوں کا خیال یہ ہے کہ خود لیلۃ القدر ہی اٹھالی گئی لیکن ان کا یہ خیال درست نہیں، باطل ہے، اس لئے کہ اگر لیلۃ القدر اٹھالی گئی ہوتی تو التمسوھا کا امر آخر کیوں کیا جاتا؟ فی السبع والتسع والخمس اس میں سوال ہوگا کہ مراد ابتداء سے ہے یا انتہا سے؟ پھر یہ کہ مہینہ انتیس کا ہوگا یا تیس کا؟ بایں طور اس کی تعیین میں عظیم الجھاؤ پیدا ہوگیا۔

گذشتہ تقریر سے ثابت ہوا کہ گناہوں کے ارتکاب سے حبط عمل کا خطرہ ہے، اس لئے ہر وقت آدمی کو خائف رہنا چاہئے اصرار علی المعاصی سے امکان کی حد تک بچنا چاہیے اور ایک ایک سانس استغفار کا ورد رکھنا چاہیئے۔ مسلمان تو درحقیقت ہے ہی وہ جس کی زندگی خوف ورجاء کے بین بین ہو۔ الایمان بین الخوف والرجاء۔ اس کے قلب میں اپنے اعمال کی جوابدہی کا احساس بھی ہو اور جناب حق تعالیٰ کی بے کنار رحمتوں کی توقع بھی۔ وقد مر تفصیلہ سابقاً۔

باب سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام الخ حدثنا.... ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے روبرو تشریف رکھتے تھے کہ آپؐ کے پاس ایک شخص آیا، پوچھنے لگا یا رسول اللہ، ایمان کیا چیز ہے آپؐ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور آخرت میں اس کے دیدار پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور حیات بعد الموت پر ایمان لائے۔ پھر اس نے پوچھا اسلام کیا شے ہے؟ آپؐ نے فرمایا اسلام

یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور یہ کہ تو نماز ٹھیک طریقہ سے پڑھے اور زکاتِ مفروضہ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔ اس نے پوچھا احسان کی حقیقت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے جیسے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے پس اگر یہ بات تجھ سے نہ ہو سکے تو یہ سمجھ کہ وہ تجھکو دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے پوچھا، قیامت کب ہو گی؟ آپؐ نے فرمایا یہ بات جواب دینے والا سائل سے زیادہ تر نہیں جانتا، البتہ میں اس کی نشانیاں بتلاتا ہوں، قیامت اس وقت آئے گی جب لونڈی اپنے سردار کو جنیگی، اور جب سیاہ اونٹ چرانے والے عمارتوں میں مفاخرہ کریں گے۔ قیامت کے وقوع کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنھیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اِنَّ اللہَ عِندَہٗ عِلمُ السَّاعَۃِ الخ اس کے بعد وہ شخص چلا گیا۔ آپؐ نے فرمایا اُسے بلاؤ، ان لوگوں کو نہیں ملا۔ آپؐ نے فرمایا یہ جبریل تھے لوگوں کو دین کی تعلیم دینے کیلئے آئے تھے۔ عبد اللہ نے کہا آنحضورؐ نے ان تمام چیزوں کا نام دین ہی رکھا ہے۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب میں امورِ اربعہ کے بارے میں سوال کو ذکر کیا ہے اور حضور علیہ السلام کے بیان کو، مقصد اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ ایمان اسلام دین ایک ہی حقیقت کے مختلف عنوانات ہیں۔ وفدِ عبدِ القیس کے بارے میں یہ ہوا کہ آپؐ نے ایمان کی بعینہٖ وہی تفسیر ارشاد فرمائی جس کو حدیثِ جبریل علیہ السلام میں اسلام کی تفسیر قرار دیا ہے۔ اسی طرح وَمَن یبتغ غیر الاسلام دیناً الخ سے معلوم ہوا کہ اسلام اور دین ایک ہیں۔ دوسری طرف یہ دریافت ہو چکا کہ ایمان و اسلام متحد الحقیقت ہیں۔ بنا بریں یہ کہنا درست ہو گیا کہ حقیقت کے لحاظ سے ایمان و اسلام اور دین ایک ہی ہیں اگرچہ مفہوماتِ لغویہ علیحدہ علیحدہ ہیں مگر ہمارا مقصد اطلاقِ شرعی

ہے اور اطلاقاتِ شرعیہ میں تینوں ایک ہیں، اس لئے مصنفؒ تینوں کے مرادف ہونے کے قائل ہیں۔ حدثنا مسدد قال حدثنا اسمٰعیل بن ابراہیم۔ جاء رجل رجل کو نکرہ اس لئے لایا گیا کہ یہ شخص اجنبی تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس کے بال بالکل سیاہ اور کپڑے بالکل سفید تھے۔ بالوں میں پراگندگی اور کپڑوں پر گرد وغبار یا ملگجاہٹ نام تک نہیں تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دور سے چلکر نہیں آیا بلکہ یہیں قریب کا رہنے والا ہے۔ کپڑوں کی صفائی اور بالوں کی سیاہی سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ طالبعلم کو چاہئے صاف رہے، اپنا حلیہ نہ بگاڑے اور نوعمری میں علم حاصل کرے۔ اور لایعرف منا احدٌ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی پردیسی ہے چنانچہ وہ نو واردِ شخص بے تکلفانہ نازشِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زانوں پر ہاتھ رکھکر بیٹھ گیا اور سوال کرنے لگا ما الایمان؟ شیخ بدرالدین نے ایک روایت میں السلام علیکم کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں، بہرحال اس روایت میں ایمان کو مقدم رکھا ہے، مسلم کی روایت میں لفظِ اسلام مقدم ہے اور ظاہر بھی یہی ہے کیونکہ اسلام کا تعلق ظاہر سے ہے اور ایمان کا باطن سے، اور ظاہر مقدم ہوتا ہو باطن پر بقربہ من الحس۔ اور یہی وجہ ہے کہ احسان کو مؤخر کر دیا گیا۔ اس لئے یوں کہا جائے گا کہ یہاں ایمان کا مقدم ہونا نتیجہ ہے راوی کے تصرف کا۔ ان تومن باللہ۔ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ سوال بھی ایمان سے ہے اور جواب میں بھی ایمان ذکر کیا گیا جس سے تفسیر و مفسر کا ایک ہونا لازم آتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ سوال ایمانِ شرعی سے متعلق ہے اور جواب ایمان لغوی سے۔ ایمان کے معنی لغۃً تصدیق کے ہیں، وما انت بمؤمن لنا ای مصدق لنا۔ اور ایمان شرعی تصدیقِ خاص یعنی تصدیقِ باللہ، تصدیق بالرسل، تصدیق بالملائکہ اور تصدیق بالقیامۃ کو کہتے ہیں۔ بلقائہ۔ لقا سے مراد کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے بعض نے رُویت مانا ہے مگر اس پر اشکال کیا جاتا ہے کہ رُویتِ باری مستحیل فی العالم الدنیا ہے۔ اہل سنت مستحیل بالذات نہیں مانتے بلکہ وہ قائل ہیں کہ رُویت باری ممکن بالذات ہے عالمِ دنیا میں اور ممکن و واقع ہے عالمِ آخرت میں، وجوہٌ یومئذ ناضرۃ الیٰ ربہا ناظرۃ۔ البتہ معتزلہ و روافض دنیا و آخرت دونوں میں رُویت کے منکر ہیں۔ امام نوویؒ نے

مذکورہ اشکال کے باعث لقاء سے مراد موت لی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اشکال صحیح نہیں ہے اس وجہ سے کہ محض امکانِ لقاء کے اعتبار سے ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر امام نووی کی تفسیر پر بھی اشکال ہو سکتا ہے کہ موت ایک فطری اور واضح امر ہے، اس کا حصول ہر ایک کیلئے اضطراری طور پر ناگزیر ہے۔ اس پر ایمان لانے کی تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ السماء فوقنا والارض تحتنا، کی تکلیف دی جائے ایمان لانے کے لئے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ موت شخصی بھی ہوتی ہے اور قرنی بھی اور نیز عالم کی بھی موت ہے۔ موتِ شخصی کا نام قیامتِ صغریٰ ہے اور موتِ قرنی کا قیامت وسطیٰ اور عالم کی موت کا نام قیامتِ کبریٰ ہے یعنی شخصِ اکبر کی موت کا نام قیامت کبریٰ ہے، اور یہاں لقاء سے مراد بھی موتِ اکبر ہے، اس لئے اشکال نہیں ہو سکتا۔ پس لقاء سے عبارت قیامت ہو گی۔ لیکن مشہور تفسیر لقاء کی رؤیت ہی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ لا تشرک بہ۔ شرک کی چار قسمیں ہیں شرک فی الذات شرک فی الصفات شرک فی الافعال شرک فی العبادات یہ چاروں قسمیں انسان کو اسلام سے خارج کر دیتی ہیں۔ یہاں حج کو ذکر نہیں کیا گیا اس کی وجہ یا تو اختصار ہے یا یہ واقعہ ہے اس وقت کا جبکہ حج فرض نہیں ہوا تھا۔ بہر حال اس جگہ ایمان و اسلام کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے، اس سے ایمان و اسلام کا متغایر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب مصنفؒ پہلے دے چکے ہیں کہ اسلام معنی مجازی یعنی انقیاد ظاہری کے اعتبار سے ایمان کے مغایر ہے لیکن معنی حقیقی کے لحاظ سے دونوں میں ترادف ہے۔ ما الاحسان؟ قال ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ یہاں دو توجیہیں کی جاتی ہیں ایک یہ کہ باری تعالیٰ نے احسان کا تذکرہ قرآن مجید میں بہت سی جگہ مادحانہ طریقہ پر کیا ہے مثلاً انَّ رحمۃ اللہ قریب من المحسنین۔ للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادہ گفتگو یہ ہے کہ جس احسان کو باری تعالیٰ قرآنِ حکیم میں ذکر فرماتے ہیں، وہ کونسا احسان ہے اور اس سے کیا مراد ہے، سوال میں اس کو پوچھنا مقصود ہے یعنی جبریل علیہ السلام نے احسان شرعی کے بارے میں سوال کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف ان تعبد اللہ کانک تراہ، سے کی ــــ دوسری توجیہ یہ ہے کہ احسان لغۃً کسی چیز کو اچھا اور حسین بنانے کو کہتے ہیں

تو یہاں سوال اس بارے میں ہے کہ عبادت کو حسین بنانے کی کیا صورت ہے۔ کانک تراہ میں کاف تشبیہ کے لئے ہے مگر مشبہ بہ موجود نہیں اس لئے یوں کہنا پڑیگا کہ ان تعبداللہ کانک عبادۃ مشابھۃ لعبدہ رائی المعبود۔ قاعدہ ہے کہ جب غلام اپنے آقا کو دیکھتا ہے تو انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ خدمت کرتا ہے، کسی بھی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر ایک شخص اس تصور سے عبادت کرتا ہے کہ گویا وہ اپنے معبودِ حقیقی کو دیکھ رہا ہے تو ظاہر ہے ایسے شخص کی عبادت کس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوگی!! اب شبہ ہوتا تھا کہ ہمارے لئے اس طرح عبادت کرنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے جبکہ رویتِ باری کا امکان ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ دوسری زندگی میں۔ اگر اس دنیا میں رُویتِ باری ممکن ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باوجود اولوالعزم پیغمبر ہونے کے لن ترانی، کی صورت میں کیوں جھڑکا جاتا؟

جواب دیا گیا کہ اہل سنت والجماعت رُویتِ باری اسی دنیا میں ممکن مانتے ہیں اور اس پر دلیل موسیٰ علیہ السلام کا سوال ہے۔ اور جنابِ حق تعالیٰ نے جو نفی کی ہے وہ امکان کی نہیں، وقوع کی ہے اسی لئے استقرارِ جبل (مکان ممکن) کی شرط پر رُویت کو معلق رکھا ہے، وما یتعلق بالممکن فھو ممکن۔ اور وقوع کی نفی اس لئے ہے کہ دنیا کے اندر جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں ان تمام کا وجود ظلّی ہے اور باری تعالیٰ کا وجود حقیقی اور ظلّی وجود حقیقی وجود کے سامنے ایک سکنڈ بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ اس اشکال کے دفعیہ کے لئے "فانہ یراک" کہا گیا یعنی اگر آپ اپنے معبود کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو یہ یقین رکھیے کہ اس کی نظریں آپ پر پڑ رہی ہیں، الم یعلم بان اللہ یریٰ۔ غلام کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ میرا آقا مجھے دیکھ رہا ہے تو یہ ٹھیک اسی طرح کام کریگا جیسے خود مالک کو دیکھنے کی صورت میں کرتا۔ تکمیلِ عمل کی پوری پوری کوشش مالک کو دیکھنے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، خود اپنے دیکھنے کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ جیسے اندھے آقا کو غلام کا دیکھنا تکمیلِ عمل کی طرف داعی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہمیں دیکھتا ہے، خواہ ہم اسے دیکھیں یا نہ دیکھیں، تو جو چیز حقیقت میں مزدور کے عمل کو کامل بنانے کی علت ہے، وہ ہر وقت حاصل ہے فالحاصل ان قولہ علیہ السلام فانہ یراک

دفع دخل مقدر ہے، اس لئے پہلی ہی توجیہ عمدہ تر ہے۔ اِن لَم تکن تراہ فانہ یراک" میں اِنْ وصلیہ ہے۔ اس حالت کا پیدا کرنا کہ مشاہدہ حالتِ رائی کے، اس وجہ سے ہے کہ لانہ یراک اِنْ شرطیہ کہنا درست نہیں۔ بعض لوگوں نے اِن کو شرطیہ مانکر دو درجہ تسلیم کئے ہیں۔ پہلا درجہ مشاہدہ کا ہے جو بہت بلند ہے اور دوسرا درجہ اس سے کم اور نیچا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلا مقام اگر تم کو حاصل نہ ہوسکے تو دوسرا مرتبہ حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن کلام اس توجیہ سے ایا کرتا ہے، پہلی توجیہ زیادہ مناسب ہے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں کان تامہ ہے، ناقصہ نہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان لم توجد یعنی اگر تو وجودِ باری میں منہمک ہوکر فنا ہو جائے تو تراہ، جزا ہے یعنی تو اللہ تعالےٰ کو دیکھ لیگا۔ دراصل خود انسان کا وجود ہی حاجب و مانع ہے رُویتِ باری میں جبکہ وہ ہم سے شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے، تو حقیقت یہ ہے کہ انسان باری تعالیٰ کو قلب کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا، ورنہ جس نے ایسا کیا اسے اللہ تعالیٰ کی رویت حاصل ہو گئی، گویا اِن لَم توجَد کے معنی یہ ہوئے کہ اگر تو فنا فی اللہ ہو جائے تو، تراہ۔ فنا کا ایک درجہ پہلا ہے جس میں علم بالفنا ہوتا ہے اور دوسرا درجہ انتہائی درجہ ہے اس کو فناء الفنا کہتے ہیں۔ اس میں احساس فنا نہیں ہوتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ دن کے وقت ستارے موجود رہتے ہیں لیکن آفتاب کی روشنی ان سب کو ہماری آنکھوں سے اوجھل رکھتی ہے، اسی طرح باری تعالیٰ کے وجود کی روشنی اگر ہمارے حاسہ پر غالب آجائے تو سب کچھ حتیٰ کہ خود ہماری ذات تک نظروں سے غائب ہو جائے۔ شاعر اسی بات کو اپنی زبان میں یوں کہتا ہے ؎

کچھ ایسے سمائے ہو میری نظر میں   جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تم ہی تم ہو

یہاں یہ معنی ہرگز نہیں کہ غیر اللہ معدوم ہو جاتے ہیں (جیسا کہ بعض کہتے ہیں) بلکہ معنی یہ ہیں کہ ہر شے اپنے وجودِ ظلی کے ساتھ موجود رہتی ہے لیکن بوجہ ضورِ وجودِ باری کے اسے کوئی شے دکھائی نہیں دیتی۔ اور یہی حقیقت ہے صوفی کے غیر اللہ کو نہ دیکھنے کی۔ یہ توجیہ امام شعرانی اور دوسرے صوفیاء نے ذکر کی ہے۔ یہ مقام کثرتِ ذکر سے حاصل ہوتا ہے کہ نہ ذکر کا پتہ رہے

اور نہ ذاکر کا بلکہ محض مذکور ہی مذکور رہے۔ منصورؒ حلاّج اسی مقام پر پہنچ گئے تھے، ان کا "انا الحق" کہنا ایسے ہی تھا جیسے آگ کی بھٹی میں تپا ہوا سرخ لوہا انا النار کا نعرہ بلند کرنے لگے، حالانکہ یہ لوہا حقیقت میں نار نہیں بنا، وہی لوہا ہے مگر آگ نے انتہائی قربت و اتصال کی وجہ سے اپنے تمام کمالات لوہے میں حلول کر دئے۔

کثرتِ نوافل و ذکر اللہ کی وجہ سے انسان ذاتِ خداوندی سے متصل و قریب تر ہو جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت کی آغوش میں لیکر اپنی صفات اس میں نافذ کر دیتا ہے اسی باعث اَولیاء اللہ سے خوارق صادر ہوتے ہیں۔ منصورؒ سے ایسے ایسے خوارق صادر ہو رہے تھے جو سوائے حق تعالیٰ کے اور سب کی دسترس سے باہر و ماورئی تھے۔ منصور کو سولی دینے میں غلطی ہوئی۔

تصوّف کی حقیقت پر مختصر سا تبصرہ تصوف کی حقیقت سے ناآشنا لوگوں نے اشتغالِ تصوف کو بدعت کہا ہے، ہم انھیں بتلانا چاہتے ہیں کہ تصوف کسے کہتے ہیں۔ دراصل تصوف کا مقصد اصلاحِ احسان ہے اور احسان ہی کو حاصل کرنے کا نام سلوک ہے، مگر مواقع کے اختلافات سے طریقہ بدل گیا جیسے علوم کا حاصل کرنا، قرآنِ حکیم کا پڑھنا اور جہاد فی سبیل اللہ آپؐ کے عہدِ مبارک میں اور طریقہ پر تھا لیکن زمان و مکان کی تبدیلی سے طریقہ میں تغیر آگیا۔ آپؐ کے زمانے میں مصحف نہیں تھے، جیسے آج موجود ہیں۔ آپؐ کے زمانے میں قرآن زبانی یاد کرایا جاتا تھا، مکمّل طور پر ایک جگہ لکھا ہوا نہیں تھا، نیز مصحفِ عثمانی میں زیر و زبر اور نقطے نہیں تھے کیونکہ اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے غلطی نہیں ہوتی تھی مگر آج ہم لوگوں کے لئے قرآن کا پڑھنا بغیر نقطے وغیرہ کے ناممکن ہے، فرمائیے کہ قرآن کا موجودہ صورت میں ہونا بھی بدعت ہے! تعلیم و تعلّم کے لئے اُس دور میں کوئی مدرسہ نہیں تھا کہئے کہ یہ مدرسے بھی بدعت ہیں۔ آپؐ کے زمانہ میں جہاد تیر و تبر، سنان اور تلوار وغیرہ سے ہوتا تھا، اگر آج ہمیں جہاد کی توفیق ہوتی ہے تو کیا ہم تیر و تبر اور تلوار لیکر ایک منٹ بھی مشین گنوں اور تباہ کن بموں کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں؟

کیا ہمارے لئے ٹینکوں، راکٹوں اور بموں کا استعمال بدعت ہوگا؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ اللہ کا نام بلند کرنے کیلئے ہر وہ طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو موثر اور کامیاب ہوگا۔

بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسان کی تعلیم فرما رہے ہیں، اس کی حقیقت آپ کی مجلس میں حاضر ہونے سے منکشف ہوتی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حنظلہ صحابی رض سے پوچھتے ہیں "حنظلہ کیا حال ہے"، یہ جواب دیتے ہیں حنظلہ تو منافق ہوگیا، فرمایا کیسے؟ عرض کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں رہتا ہوں تو جنت و جہنم میرے سامنے رہتے ہیں، ایمان بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے، کسی بھی بات میں کوئی شبہ نہیں ہوتا لیکن آپ کی مجلس سے علیحدہ ہونے کے بعد نہ وہ کیفیت باقی رہتی ہے نہ وہ اذعان بلکہ شکوک و شبہات سامنے آنے لگتے ہیں۔ ابو بکر صدیق بولے یہ بات تو میرے ساتھ بھی ہے، چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کریں۔ چنانچہ آپ سے عرض کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا اگر از خود ایسا ہوتا ہے تو کوئی حرج نہیں، البتہ اگر آپ اپنے طور پر شبہات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے یا شکوک و وساوس کو دل و دماغ میں ٹھہرنے کا موقع دیں گے تو واقعتہً نقصان ہوگا۔ ورنہ اگر ہمیشہ تم اسی حالت پر قائم رہتے جو حالت میری مجلس میں ہوتی ہے تو ملائکہ چلتے پھرتے تمہارے فراش پر تم سے مصافحہ کرتے تمہارے سے دنیا کے کام نہ سنبھل سکتے۔

پھر یہ بھی تو ہے نا کہ تموّج ہمیشہ اسی دریا میں پیدا ہوتا ہے کہ جس میں پانی ہوا اور زیادہ مقدار میں ہو شیطان شکوک و شبہات کا لشکر لیکر اُسی قلب میں آئے گا جہاں ایمان کی فوجیں خیمہ زن ہوں، بہر حال یہ تھا آپ کی روحانی طاقت کا اثر۔ جو بھی کوئی ایمان کے ساتھ آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا قلب میں ایک ایسی تڑپ پیدا ہوتی کہ آج سالہا سال کی زبردست ریاضت کے بعد بھی وہ تڑپ نہ پیدا ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے "دیز کیہم" میں اسی کو بتلایا گیا ہے۔ حضرت انس رض کہتے ہیں کہ ہم آپ کو دفنانے کے بعد ابھی مٹی بھی نہیں جھاڑنے پائے تھے کہ ہمیں ظلمت آتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ غور کیجئے ہمارے قلوب پر ظلمتوں کا کیا عالم ہوگا! ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانے سے جتنے بعید ہوتے جائیں گے ہمارے دلوں پر اتنا ہی زنگ چڑھتا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جس شے پر جتنا زنگ ہوگا اسی قدر اسے صیقل کرنے کی ضرورت پیش آئیگی تو تصوف کے موجودہ طرق جو کہ علمائے اہلِ سنت سے ثابت ہیں کسی طرح بدعت نہیں کیونکہ اس سے مقصود احسان ہی حاصل کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ ڈھونگ رچانا۔ اور جہاں درحقیقت یہ مقصد نہیں ہے وہاں نہ صرف یہ کہ بدعت ہے بلکہ خطرناک گمراہی۔ بہر کیف اِن لَم تکن تراہ الخ میں اشکال ہوتا ہے کہ جزاء مجذوم ہوا کرتی ہے اور اس موقعہ پر تراہ ہے جس میں الف کا وجود عدمِ جزم کو بتلا رہا ہے اس کا جزا ہونا درست نہیں ؟ جواب دیا گیا کہ الفیہ میں ابن مالک نے تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ موسیٰ اسمِ مقصوری ہے اور بہرحال اپنی حالت پر باقی رہتا ہے لیکن بحالتِ رفع ضمہ مقدر ہوتا ہے اور بحالتِ نصب فتحہ اور حالتِ جر میں کسرہ اور فعلِ معتل میں علامتِ جزم حذف الواف والالف، کو کہا گیا ہے لیکن ایک لغت یہ ہے کہ علامتِ جزم سکونِ الف ہے۔ اس لئے اگرچہ لغتِ مشہورہ کی وجہ سے فان لَم تکن ترہ ہونا چاہیے مگر دوسری لغت کے اعتبار سے تراہ صحیح ہے۔

میں نے تین توجیہیں بیان کی ہیں جنمیں پہلی توجیہ وہ ہے جسے رائج ہونے کی وجہ سے عام طور پر شارحین لکھتے ہیں۔ متی الساعۃ۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ساعت کے وقوع کے متعلق دریافت کیا۔ السّاعۃ میں الف لام عہد کا ہے اور مراد اس سے وہ خاص وقت ہے جبکہ تمام اِنسانوں کا حساب و کتاب ہوگا جسے ہم لوگ قیامت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اَب سوال ہوتا ہے کہ ساعت، کی کل میعاد ۲۴ گھنٹے کی ہے اور عرفی کی زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔ اور قیامت ایک طویل زمانہ تک قائم رہے گی پھر کیا وجہ ہے کہ "السّاعۃ" کہا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فی الواقع قیامت کی گھڑی ہوگی تو بہت طویل مگر باری تعالیٰ کے نزدیک کلمح البصر سے زیادہ اس کا وقت نہیں ہوگا اس لئے ساعت کا لفظ استعمال کیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس جگہ جزء بولکر کُل مراد لیا ہے جیسے فاتحہ بولکر پوری سورت مراد

لیتے ہیں یا الم سے مکمل سپارہ مراد لیا جاتا ہے حالانکہ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سورت صرف فاتحہ اور پورا سپارہ الم کے الفاظ نہیں۔ ماالمسئول عنہا باعلم من السائل۔ نفی اعلمیت سے مقصود نفی علم ہے اور چونکہ عموماً سائل ناواقف ہوتا ہے (اور یہاں مسئول عنہ بھی ناواقف ہے) اس لئے دونوں کے غیر عالم ہونے کو بتانے کے لئے یہ عذر اختیار کیا ہے اور الکنایۃ أبلغ من التصریح کے مشہور قاعدہ کی بناء پر آپ کا یہ جواب اصول بلاغت کے موافق ہے اب سوال یہ ہے کہ حضرت جبریل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کے بعد صدقت " فرمایا اور تصدیق کرنا علم کی دلیل ہے اور سوال کرنا جہل کی دلیل۔ صحابہ کرام کو اسی وجہ سے تعجب ہوا، تو واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جبریل علیہ السلام صحابہ کی طرف سے نائب ہو کر سوال کر رہے ہیں۔ اور بعض روایات میں اس کی تفصیل بھی ہے۔ یاایھا الذین آمنوا لا تسئلوا عن اشیاء الخ آیت نازل ہو چکی تھی اس لئے صحابہ چاہتے تھے کہ کوئی سمجھدار آدمی آئے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہم اہم باتوں سے متعلق سوالات کرے چنانچہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور نائب عن الصحابہ کی حیثیت سے سوالات کرنے لگے، چونکہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ان سے ناآشنا ہیں اس لئے جبریل علیہ السلام اس حیثیت سے ناواقف ہیں، سائل ہیں اور باعتبار اپنی شخصیت کے عالم ہیں اسی لئے صدقت فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پر ان کے اصلی منصب کے لحاظ سے فرما رہے ہیں ماالمسئول عنہا باعلم من السائل، ای ای سائل کان لیس فیہ تخصیص زید دون بکر وکذالک ای مسئول عنہ کان لیس فیہ شیٔ من التخصیصات۔ ان اللہ عندہ علم الساعۃ۔ عندہ خبر مقدم ہے حصر کے لئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو بھی قیام ساعت کا وقت معلوم نہیں، اسی وجہ سے فرمایا گیا ان الساعۃ آتیۃ اکاد اخفیہا الخ یہاں تک کہ اسکا علم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نہایت ہی مقرب فرشتہ جبریل علیہ السلام کو بھی نہیں دیا گیا، ارشاد ہے یسئلونک عن الساعۃ ایان مرساہا فیم انت من ذکراہا الیٰ ربک منتہاہا۔ ان تلد الامۃ ربتہا۔ امۃ سے مراد باندی ہے، یا مطلقاً عورت رب سے عبارت ہے حکومت والا یا صرف باندی کا آقا۔ غرض یہ کہ ان تلد الامۃ الخ سے یا تو

یہ مراد ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جب باندیاں اپنے آقاؤں کو جننے لگیں گی۔ اگر آپ کہیں کہ باندیوں کا سلسلہ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے پہلے سے چلا آرہا ہے کہ باندی اگر سریہ ہے (جماع کے لئے ہے) تو بچہ سبب ہوگا باندی کی آزادی کا اور وہ خود تو آزاد ہو ہی گا بہر حال یہ کوئی نئی بات نہیں پھر اسے علامتِ قیامت کیسے قرار دیا گیا؟

جواب یہ ہے کہ بلاشبہ باندیوں کا سلسلہ زمانہ سابق سے چلا آرہا ہے لیکن وہ صرف خرید و فروخت تک محدود تھا، جہاد کے ذریعہ باندیاں بکثرت حاصل نہیں کی جاتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ایما ہے اس بات کی طرف کہ اسلام کا غلبہ ہوگا، فتوحات کثرت سے ہوں گی اور زیادہ سے زیادہ باندیاں اپنے قبضہ میں آئیں گی، ان سے بچے پیدا ہوں گے اور پھر وہ باندیوں (اپنی ماؤں) کے آقاؤں کے قائم مقام ہوں گے۔ جب ہر ہر ملک میں اسلامی اقتدار ہوگا، حکومتِ الٰہیہ قائم ہوگی تو ظاہر ہے کہ اس سے امہات الاولاد کی کسقدر کثرت ہوگی یہاں بعض لوگوں نے اشکال کیا ہے کہ قیامِ ساعت کی علامات تو چاہئے یہ کہ برائیاں ہوں اور ... اسلام کا غلبہ، بہر حال امرِ خیر ہے پھر کیوں اسے علامتِ ساعت قرار دیا گیا؟ اس کے دو جواب دیئے جاتے ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ بعض حسنات بھی قیامت کی علامتوں میں سے ہیں۔ علاماتِ قیامت کا برائیوں ہی میں سے ہونا ضروری نہیں۔ اقتربت الساعۃ وانشق القمر۔ شقِ قمر امرِ خیر ہے نعمت ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ نازل ہونا، اور امام مہدی کا ظاہر ہونا یہ تمام باتیں امورِ خیر ہیں نعمتیں ہیں۔ شر ور اور نقمتیں نہیں، لیکن باوجود اس کے پھر علاماتِ قیامت میں سے ہیں۔ اسی طرح بلاشبہ اسلام کا غالب آنا اور اس کے روبرو تمام طاقتوں کا سرنگوں ہو جانا، امرِ خیر ہے لیکن بایں ہمہ قیامت کی علامت ہے ـــــ دوسرا جواب یہ ہے کہ قاعدہ ہے اذا تم شئی بدأ نقصہ۔ حجاج کے واسطے کسی عورت نے کہا تھا کہ خدا اس کو کمال تک پہنچادے، حجاج نے یہ سنکر کہا یہ عورت مجھے بد دعا دے رہی ہے، کیونکر کمال کے بعد زوال یقینی شے ہے۔ ہر کمال را زوال۔ قدرت کا اٹل

قانون ہے۔ پس کمال غلبۂ اسلام کے بعد نقص و زوال جبلی طور پر شروع ہو جائے گا۔ اس وجہ سے کہا جائے گا کہ یہ امر خیر نہیں ہے۔

اَن تلد الامۃ ربتہا، کی ایک توجیہ یہ ہے کہ امۃ سے مراد مطلقاً عورتیں ہیں اور مقصد یہ ہے کہ اولاد اپنے غلط کردار کے باعث گویا اپنی ماؤں کی مالک، حاکم ہو جائے گی، ماں کی اطاعت و فرماں برداری چھوڑ کر خود ماں کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر مجبور کرے گی۔ تو گویا یہ کنایہ ہے عقوق الوالدین سے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ امۃ سے مراد باندی اور رَب سے آقا ہے، تو معنی یہ ہوں گے کہ لوگ شریعت کی مخالفت کریں گے، امِ ولد فروخت کی جانے لگے گی کثرت کے ساتھ یہانتک کہ وہ بکتے بکتے اپنے بیٹے کی ملک میں پہنچ جائے گی اور وہ اس سے ہر طرح کا کام لیگا، اور نہیں شناخت کر سکے گا کہ یہ میری ماں ہے ــــ ایک توجیہ یہ بھی ہے ان تلد الامۃ ملوکاً یعنی باندیوں سے بادشاہ پیدا ہوں گے، صاحبِ اقتدار پیدا ہوں گے۔ بنی عباس سے پہلے بادشاہ عموماً لونڈیوں سے دامن کشاں رہتے تھے لیکن بنی عباس نے اس طریقہ کو چھوڑ دیا اور لونڈیوں سے ہمکنار رہنے لگے۔ چنانچہ اُمار سے بچے پیدا ہوئے اور بڑے ہو کر حکومتوں پر قابض ہوئے۔ تو اَن تلد الامۃ ملوکاً، کا مطلب ہو گا کہ رذیل اور کمینے لوگ معزز تریں بن جائیں گے، دنیا کا اقبال اور اس کی دولت و حشمت سب ان کے ہاتھ آئے گی اور جو لوگ معزز تھے ان کی عزتیں خاک میں مل جائیں گی، دنیا اُن پر تنگ ہو جائے گی۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اَن تلد الامۃ ربتہا اور اس کے بعد والا جملہ کنایہ ہے انقلاب حالات سے یعنی جب اتنا انقلاب رونما ہو جائے کہ اپنی اولاد آقا اور حاکم بن جائے، اشرفا کی جگہ رذیل لوگ آجائیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ عنقریب تمام عالم میں ایک عظیم انقلاب آنے والا ہے جسے اسلام قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ البہم۔ یہ رعاۃ کی صفت بھی ہو سکتی ہے اور ابل کی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایسا وقت آجائے کہ اونٹوں کے چرانے والے یعنی نیچے درجے کے لوگ مفاخر کرنے لگیں اور انتہائی دولت و خوشحالی کی وجہ سے جنگلات اور ویرانے چھوڑ کر آبادیوں میں آجائیں،

جھونپڑیوں کے رہنے والے بڑی بڑی بلڈنگیں تعمیر کرانے لگیں، جاہل و ناکارہ لوگ اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہو جائیں، اس سے اشارہ اسی بات کی طرف ہے جیسے علامہ طیبی نے بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے زمامِ کار جب نااہل ہاتھوں میں آجاتی ہے تو اولاً ان کے اقتدار کی حد تک اور بعد میں دور دور تک عظیم فساد برپا ہو جاتا ہے، زمین پر ہزار ہا فتنے جاگ اٹھتے ہیں اس لئے کہ وہ لوگ کم ظرف ہوتے ہیں، تعمیری صلاحیتوں سے کورے، نامحل شناس، ناخدا ترس اور غیر معاملہ فہم ہوتے ہیں۔ ان کے قلوب میں سوائے جلبِ منفعت کے دوسرا جذبہ نہیں ہوتا۔ جب اقتدار کی باگیں ایسے دنی ہمت اور کمینہ خصلت لوگوں کے ہاتھوں میں آجائیں تو اس کا خطرناک انجام ظاہر ہے۔ الوضیع اذا ارتفع تکبر واذا حکم تجبر۔ آج مذہبی اداروں سے لیکر ملکی وزارتوں تک جو دنیا میں بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہیں، اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ زمامِ کار اکثر نااہل اور قطعاً نااہل ہاتھوں میں ہے۔ حالات بتلا رہے ہیں کہ کسی وقت بھی تمام عالم میں فسادِ عظیم برپا ہو سکتا ہے۔ زمانہ قدیم کے الحاد پسند لوگ سرے سے قیامت ہی کا انکار کرتے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک دن یہ تمام عالم ختم ہو جائے گا، زمین و آسمان فنا ہو جائیں گے۔ لیکن موجودہ دور کے "ترقی یافتہ جاہل" جنھیں اپنے علوم و افکار پر مکمل اعتماد ہے، بھروسا ہے، قیامت کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، خوف زدہ ہیں۔ اور ان کا یہ خوف چاند گہن کے وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک زمین چاند سورج اور ستارے ایک دوسرے کی کشش کی وجہ سے قائم ہیں۔ کسی وقت بھی اگر ان چیزوں کی باہمی کشش کم پڑ جاتی ہے تو ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کا ہر دست یقین ہے۔ مثلاً کسی وجہ سے اگر زمین کی کشش کم ہو گئی تو یہ چاند یا دوسرے سیارے کی طرف کھچ جائے گی اور اس سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیگی۔ چاند گہن کے وقت اس کی کشش پر اثر پڑتا ہے، کرۂ ارض سے اس کا اتصال بڑھ جاتا ہے جس کے باعث سائنس دانوں کے یہاں قیامت کا سخت خطرہ رہتا ہے۔ تطاول۔ عمارت کی اونچائی میں فخر کرنا کہ میرا مکان چار منزلہ ہے تیرا تین منزلہ۔ چرواہوں میں خصوصیت سے اونٹوں کے

چرواہے اخلاقی اعتبار سے بہت گرے ہوئے ہوتے ہیں، اور قاعدہ ہے المعجۃ مؤثرۃ، آپ فرماتے ہیں السکینۃ والوقار فی اہل الغنم والفخر والخیلاء فی اہل الابل۔ اونٹ کا غصہ مشہور ہے کہ جب یہ غصہ میں کسی کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے تو نہیں چھوڑتا۔ ہاتھی جیسا عظیم الجثہ جانور بھی اونٹ سے گھبراتا ہے۔ ہم نے گجرات میں ایک موقع پر ہاتھیوں کا بہت بڑا جلوس دیکھا اس ترتیب سے کہ چار چار ہاتھیوں کے درمیان ایک ایک اونٹ رکھا گیا تھا، ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اونٹوں کے خوف سے ہاتھیوں میں جوش پیدا نہیں ہوتا، وہ بگڑنے سے باز رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ اونٹوں کے چرواہے اونٹوں ہی کی طرح بدخو ہوتے ہیں، اس سے اشارہ اسی بات کی طرف ہے جسے ہم ابھی ذکر کرکے آئے ہیں۔

باب ... حدثنا ... عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھے ابوسفیان ابن حرب نے خبر دی کہ مجھ سے ہرقل نے کہا میں نے تجھ سے پوچھا کہ محمد کے دین میں داخل ہونے والے لوگ زیادہ ہوتے جاتے ہیں یا کم، تو نے جواب دیا زیادہ۔ ایمان کی یہی بات ہوتی ہے تاکہ دلوں میں پوری طرح راسخ ہو جائے۔ میں نے تجھ سے معلوم کیا، کیا کوئی دینِ محمدی میں داخل ہونے کے بعد ناخوش ہوکر مرتد بھی ہوتا ہے؟ تو نے جواب دیا نہیں، ایمان کی یہی حالت ہے کہ جب اس کی بشاشت دلوں میں آجاتی ہے تو کوئی اسکو ناگوار محسوس نہیں کرتا۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں باب کو بلا ترجمہ قائم کیا ہے گویا یہ کالفصل للباب السابق کے طور پر ہے۔ ہرقل نے سخطۃ لدینہ میں جس چیز کو دین کہا ہے اسی کو آگے چلکر کذالک الایمان سے تعبیر کیا ہے معلوم ہوا کہ دین و ایمان کی ایک ہی حقیقت ہے، پس اس سے سابقہ ترجمہ ثابت ہوگیا اور اس کو الگ کرکے اس واسطے بیان کیا کہ اولاً ثبوت شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اعتبار سے تھا اور ہرقل کے جواب کا مدار شریعتِ سابقہ پر ہے اس لئے معلوم ہوگیا کہ دین و ایمان جس طرح شریعت محمدیہ میں ایک ہیں اسی طرح شرائع سابقہ میں بھی متحد ہیں۔ فثبت المدعیٰ

اشکال ہوتا ہے کہ ہرقل غیر مومن ہے اس کے قول سے استدلال درست نہیں ہو سکتا! اس لئے کہ یہاں بحث ایمان شرعی سے ہے، یہاں ارشادِ نبی یا قول صحابی سے اس کا اثبات ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ آگے آئے گا مصنفؒ کا مذہب ہے شرایعنا من قبلنا شریعۃ لنا بشرطین اما الاول انہ یذکرہ فی الکتاب ای القرآن والحدیث او لم یذکر فی الکتاب او فی الحدیث الثانی انہ غیر منسوخ۔ الحاصل یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے ثابت شدہ حکم مثلاً ہمارے یہاں منسوخ نہیں ہے تو وہ ہماری ہی شریعت کا حکم ہے اسی لئے حدیثِ ہرقل کو بتائیدِ وحی کتاب کے شروع میں لایا گیا ہے۔

باب فضل من استبرأ لدینہ۔ حدثنا۔۔۔ نعمان ابن بشیر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے حلال و حرام واضح ہیں اور ان کے مابین مشتبہات ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے پس جو شخص مشتبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کیلئے ذم شرعی سے برأت حاصل کی۔ اور جو شخص مشتبہات میں الجھا اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو اپنی بکریاں کھیت کے متصل چراتا ہے قریب ہے کہ وہ بکریاں کھیت میں گھساوے۔ خبردار ہر ایک بادشاہ کیلئے رکھ ہے۔ خبردار! اللہ تعالیٰ کی زمین میں مقررہ رکھ حرام چیزیں ہیں۔ خبردار! بدن میں ایک ٹکڑا مقرر ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ خراب ہوتا ہے تو تمام جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ خبردار! وہ ٹکڑا قلب ہے۔

استبرأ بری چیز کے دور کرنے اور اس سے خلاصی حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے دین کو ہر طرح کے میل کچیل اور ہر طرح کی گندگی سے پاک کرنا کمال ہے۔ اور بعض سے پاک کرنے میں دین ناقص رہ جاتا ہے۔ اس سے بھی ایمان میں زیادۃ و نقصان کا پتہ چلتا ہے،

الحلال بیّن والحرام بیّن۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام امور حلال ظاہر ہیں یا تمام محرمات ظاہر ہیں ورنہ فیہما مشتبہات کے کوئی معنی نہیں رہتے، اور نہ ہی اجتہاد و تحری کی کوئی ضرورت، بلکہ معنی

یہ ہیں الحلال بین حکمہ ای کل حلال یباح تناولہ، وکذالک الحرام بین حکمہ ای کل حرام لایباح تناولہ وبینہما مشتبہات ای حکمہا خفی لایعلم ان تناولہا حلال أولایجوز ارتکابہا۔ فیجب ان لایقرب الرجل من المشتبہات التی یعلم من وجہ انہا یجوز ویعلم من وجہ انہا لایجوز فمن اتقی المشتبہات استبرأ لدینہ حمیٰ، اس جگہ کو کہتے ہیں جس کو بادشاہ نے اپنے جانوروں کے چرانے کیلئے مخصوص کر رکھا ہو، دوسرے لوگوں کو اس میں اپنے جانور چرانے کی اجازت نہ ہو۔ عرب کا یہ عام رواج تھا کہ بڑے بڑے سردار اپنے جانوروں کے لئے ایک وسیع جگہ مخصوص کر رکھتے تھے جسمیں صرف انھیں کے جانور چرتے تھے، دوسروں کو وہاں جانور لیجانے کی بالکل اجازت نہیں ہوتی تھی اور اگر کوئی خلاف ورزی کرتا تھا تو ــــ سردار کے سخت ترین عتاب میں آجاتا تھا۔ تو آپؐ تشبیہ دے رہے ہیں کہ جو شخص مشتبہات سے نہیں بچتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ وہ حمیٰ کے قریب اونٹ چراتا ہے، یہ قریب ہوگا اس بات کے کہ کہیں اونٹ وغیرہ حمیٰ میں داخل نہ ہوجائیں اور پھر آپؐ وضاحت فرماتے ہیں، الا ولکل ملک حمی الخ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بھی حمیٰ ہیں، یعنی محرمات، لہٰذا ان سے بچنا ضروری ہے، ورنہ شدید عذاب ہوگا۔ دفعِ مضرت بڑھکر ہے جلبِ منفعت سے۔ باب اداء الخمس من الایمان۔ حدثنا.... ابی جمرہ سے روایت ہے، کہتے ہیں

کہ میں ابن عباسؓ کی صحبت میں بیٹھتا تھا، وہ مجھے اپنے تخت پر بٹھا لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم میرے پاس رہا کرو میں اپنے مال میں سے تمہارے لئے حصہ مقرر کردوں گا۔ میں دو مہینے ان کے پاس ٹھہرا رہا پھر انھوں نے وفدِ عبدالقیس کے بارے میں کہا کہ جب وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کون ہے یہ قوم؟ یا فرمایا کون ہے یہ وفد؟ (یہ راوی کا شک ہے) ان لوگوں نے جواب دیا ہم ہیں ربیعہ۔ آپؐ نے فرمایا مبارک ہو قوم کو یا وفد کو (شکِ راوی)، تم اس حالت میں آئے کہ نہ رسوا ہوا اور نہ پشیمان، انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ہمیشہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتے، سوائے اشہر حرم کے کیونکہ ہمارے

اور آپؐ کے درمیان کفار مضر آباد ہیں، آپؐ ہمیں ایسا حکم فرما دیجئے جو حق و باطل کے درمیان فرق کر دے اور ہم اپنے دوسرے لوگوں کو اس سے مطلع کر دیں اور ہم اس کے سبب جنت میں داخل ہوں۔ نیز وفد عبد القیس نے برتنوں کے استعمال کے بارے میں سوال کیا پس آپؐ نے چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے منع فرمایا، حکم فرمایا اللہ واحد پر ایمان لانیکا۔ فرمایا کیا جانتے ہو تم اللہ واحد پر ایمان لانا کیا ہے؟ عرض کیا اللہ اور اسکا رسول زیادہ جاننے والا ہے، آپؐ نے فرمایا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، کی شہادت دینا نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا۔ اور آپؐ نے انہیں چار برتنوں سے منع فرمانا حنتم (لاکھی مرتبان) سے، دُبَّاء (کدو کے تونبے) سے، نقیر (درخت کی جڑ کے بنے ہوئے برتن) سے، مزفت (رال کے روغن کئے ہوئے برتن) سے۔ اور فرمایا ان چیزوں کو یاد رکھو اور اپنے دوسرے لوگوں کو اس سے آگاہ کر دو۔

جس طرح ادائے زکات من الایمان ہے اسی طرح ادائے خمس بھی من الایمان ہے۔ مالِ غنیمت کے متعلق حکم یہ ہے کہ اس کے پانچ حصے کئے جائیں ایک حصہ بیت المال میں دیا جائے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا، خدا کا اور یتامیٰ و مساکین وغیرہ کا حق ہوگا جسے قرآن میں ذکر کیا گیا ہے واعلموا انما غنمتم الخ اور باقی ماندہ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلی شریعتوں میں مالِ غنیمت حرام تھا چنانچہ وہ سب ایک جگہ جمع کر کے نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا یعنی ایک اونچے ٹیلے پر رکھ دیا جاتا تھا آسمان سے ایک آگ اترتی تھی وہ اس مال کو جلا دیتی تھی۔ یہ علامت ہوتی تھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی نیت و جد و جہد اور قربانی کے مقبول ہونے کی، یہ امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ اس کے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا۔

عن ابی جمرۃ قال کنت اقعد الخ یہ ابوجمرہ کا واقعہ ہے، ابوجمرہ فارس کے رہنے والے ہیں، فارسی زبان کے ماہر ہیں انہوں نے عمرہ و حج کی نیت کی، قران کا احرام باندھا، اس لئے کہتے تھے لبیک

بحجۃ وعمرۃ" اور حضرت عمرؓ نے اور حضرت عثمان وغیرہ نے قِران کی ممانعت فرمادی تھی تاکہ لوگ بار بار خانہ کعبہ کی زیارت کو حاضر ہوں۔ فرماتے تھے ہر عبادت کیلئے مستقل سفر کرو" اس مسئلہ میں بعض صحابہ کو اختلاف تھا دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ لوگ میقات سے حج کا احرام باندھتے تھے تو اس کا تقاضا ہوتا تھا کہ یوم عرفہ تک ایک ہی احرام میں رہیں مگر مکہ پہنچکر عمرہ کا احرام باندھکر افعالِ عمرہ کرکے حلال ہو جاتے تھے پھر یوم ترویہ میں احرامِ حج باندھتے تھے اس کو فسخ حج الی العمرہ کہتے ہیں اس سے بھی حضرت عمرؓ نے سختی کے ساتھ روکدیا تھا۔ بہرحال ابوجمرہ کو قران کا احرام باندھکر لبیک بحجۃ وعمرۃ، کہتے ہوئے دیکھا تو پوچھا اتر ون ہذا انعل او جملہ؟ ابوجمرہ نے وجہ دریافت کی تو کہا گیا کہ حضرت عمرؓ نے قِران کی ممانعت فرمادی ہے۔ ابوجمرہؓ کو سخت افسوس ہوا لیکن کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبیک بحجۃ وعمرۃ، فرمارہے ہیں، میں نے اس کا ذکر ابن عباسؓ سے کیا، فرمایا سنۃ ابی القاسم صلی اللہ علیہ وسلم لِاَنہ علیہ السلام کان قارناً، ابن عباس کو اسی وقت سے ابوجمرہ پر صلاح وتقویٰ کا گمان ہوگیا اور انھیں اپنے تخت پر بٹھا لیا۔ ابن عباسؓ اس وقت بصرہ کے والی تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہ کی جانب سے قضایا کے سلسلہ میں، انھیں بہت سے ان فارسی لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا جو عربی سے بالکل ناواقف ہوتے تھے، اس لئے ابن عباسؓ نے ترجمان کے طور پر ابوجمرہؓ کو اپنے یہاں رکھ لیا اور خود ان کے جمیع اخراجات کے کفیل بن گئے، کیونکہ ترجمان والی کی اپنی ضروریات میں سے ہے۔ ابوجمرہؓ نے ایک دن حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ میں نبیذ پیتا ہوں اگرچہ اس میں نشہ وسکر نہیں ہوتا مگر تاہم فضیحت کا خطرہ رہتا ہے ابن عباسؓ نے اِس پر یہ واقعہ نقل کیا۔

واقعہ وفدِ عبدالقیس عبدالقیس بحرین کا ایک قبیلہ ہے، اس قبیلہ کا ایک فرد منقذ ابن حبان اپنے یہاں کے کپڑے لاکر مدینہ کے بازار میں فروخت کر رہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اس شخص سے بحرین کے مشاہیر اور منذر ابن عائذ الاشج کی بابت دریافت فرمانے لگے۔ یہ دیکھکر اسے سخت حیرت ہوئی کہ رسول اللہ کبھی بحرین گئے نہیں پھر کس طرح

وہاں کے متعلق آپ کو یہ معلومات حاصل ہوئیں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منقذ ابن حبان کو اس طرح متعجب دیکھکر پوری طرح سمجھایا اور اسلام پیش کیا چنانچہ منقذ ابن حبان فوراً ایمان لے آئے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ آیات پڑھکر مکان کی طرف مراجعت کی، یہ زمانہ اشہر حرم کے ختم ہونے کا تھا۔ جس وقت یہ شخص مکان پہ پہنچے اور ان کی بیوی نے انھیں وضو کرتے ہوئے اور نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے باپ سے جاکر پوری حالت بیان کی کہ میرا شوہر جب سے یثرب سے آیا ہے نہ جانے کیوں ایک خاص طریقہ سے اعضاء کو دھوتا ہے اور پھر ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے، اسکا باپ وہی شخص ہے جس کی بابت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منقذ ابن حبان سے دریافت فرمایا تھا یعنی منذر ابن عائذ الاشج (سردار قبیلہ) چنانچہ منذر ابن عائذ نے داماد کو بلایا اور بیٹی کی زبانی جو باتیں معلوم ہوئی تھیں ان کی تحقیق کی۔ منقذ ابن حبان نے خسر کے سوال پہ مکمل واقعہ بیان کیا اس نے سردار کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا یہاں تک کہ یہ بھی ایمان لے آئے، لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے تہہ دل سے قائل ہو گئے اور قبیلہ کے دوسرے لوگوں کو بھی اسلام کی طرف بلانا شروع کر دیا جس میں انھیں ایک حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ چونکہ یہ وقت اشہر حرم کا نہیں تھا اس لئے منذر ابن عائذ الاشج جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے، وہیں رہتے ہوئے ان کی تبلیغی سرگرمیاں برابر جاری رہیں چنانچہ آئندہ سال تک ایک کافی بڑی جماعت مشرف بہ اسلام ہو گئی اور چالیس اشخاص جنمیں چودہ سرداران قبائل تھے، مدینہ منورہ آئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وفد عبد القیس ایک مرتبہ آیا ہے یا دو مرتبہ بعض نے کہا ہے کہ یہ وفد ایک ہی مرتبہ آیا ہے سنہ ھ میں۔ اور بعض نے کہا کہ وفد عبد القیس دو مرتبہ آیا ہے سنہ ھ میں چودہ اور سنہ ھ میں چالیس آدمی۔ بہرحال مدینہ کے قریب پہنچکر سوائے منذر ابن عائذ الاشج کے تمام لوگ اونٹ اور سارے سامان کو چھوڑ کر از فور شوق میں دوڑتے ہوئے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ منذر ابن عائذ نے اس طرح بے چینی و اضطراب کا اظہار نہیں کیا بلکہ ایک مکان کرایۃً یا عاریۃً لیکر نہایت سکون واطمینان سے

اس میں سامان رکھا، اونٹ باندھے اور خود نہا دھو کر کپڑے بدلے اس کے بعد سرکارِ دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں شرفِ باریابی حاصل کیا۔ آپ نے ان کے اس عمل کی بہت تعریف فرمائی، اور فرمایا کہ تمہارے اندر دو خصلتیں نہایت عمدہ ہیں، باری تعالےٰ ان کو بہت پسند کرتا ہے اِناۃ اور حلم۔ منذر ابن عائذ بدشکل آدمی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی طرف دیکھا تو منذر ابن عائذ نے عرض کیا یا رسول اللہ انسان کی قدر و قیمت اس کے جسم سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی قیمت زبان و قلب سے ہوتی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے جو مجھ میں دانائی و بردباری بیان فرمائی ہے، وہ پیدائشی ہے یا کسبی؟ فرمایا پیدائشی، بہرحال منذر ابن عائذ کی یہ جماعت کئی روز یہاں رہی۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں نے بہت سے مسائل سیکھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا مَن الوفد او مَن القوم، انھوں نے جواب دیا ربیعہ۔ ربیعہ ایک بڑا قبیلہ تھا۔ مرحبا۔ رُحب وسعت کے معنی میں آتا ہے، عرب جس وقت ایک دوسرے کے پاس جاتے ہیں تو استقبال کرنے والے کہتے ہیں مرحبا یعنی آپ آرام دہ اور وسیع مکان میں آئے، سیف ذو یزن عرب میں ایک مشہور شخص گذرا ہے، لفظِ مرحبا اسی نے نکالا ہے اور اسی وقت سے یہ کلمہ آج تک رائج ہے۔ غیر خزایا ولا ندامٰی۔ خزایا جمع خزیان کی ہے اور ندامٰی جمع ندمان کی۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اگر از خود ایمان لاکر حاضر نہ ہوتے بلکہ مسلمانوں سے جنگ کرتے جیسے کہ ابو سفیان، عکرمہ اور خالد بن ولید وغیرہ نے کی اور پھر بعد میں قید و بند کی صورت میں لائے جاتے تو تمہیں کسقدر ندامت محسوس ہوتی اور سابقہ حرکتوں پر کتنا رنج ہوتا کہ ہم نے شروع ہی میں کیوں ایمان قبول نہ کرلیا اور کیوں مسلمانوں سے جنگ کی، لیکن تم نے چونکہ ایسا نہیں کیا خود بخود سمٹ کر اسلام کے نجات آفریں دامن میں چلے آئے اس لئے نہ تو تمہاری رسوائی ہوئی اور نہ تمھیں ندامت سے دوچار ہونا پڑا۔ بیننا و بینک ہٰذا الحی من کفار مضر۔ عرب مستطیل شکل کا جزیرہ نما ہے اور بحرِ قلزم و خلیج فارس کے درمیان واقع ہے، اس کے تین حصے میں ایک نشیبی حصہ ہے جسے

تہامہ کہتے ہیں جو بحیرہ قلزم کے کنارے پر پھیلا ہوا ہے۔ اور وہ اونچی زمین جو درمیان میں ہے اس کو نجد کہا جاتا ہے اس پر پہاڑوں کی ایک قطار ہے جو مغرب میں مکہ تک چلی گئی ہے اور نجد و تہامہ کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ ہے اس کا نام حجاز ہے۔ اس کو حجاز اس لئے کہتے ہیں کہ یہ حاجز بین النجد والتہامہ ہے۔ بحرین سے مدینہ منورہ آتے ہوئے درمیان میں نجد پڑتا تھا جس میں کفار مضر آباد تھے جو بڑے شقیق القلب اور خونخوار تھے، اہل بحرین سے ان کی لڑائی چلی آرہی تھی اس وجہ سے یہ لوگ صرف اشہر حرم میں مدینہ آسکتے تھے۔ علاوہ ازیں اور دنوں میں ان کے لئے مدینہ آنا سخت دشوار تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حضرات کہہ رہے ہیں کہ مسائل معلوم کرنے کیلئے بار بار آنا ہم لوگوں کیلئے ممکن نہیں، جناب والا ہمیں دین کے اصول بتلا دیجئے گا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا اور من جملہ شراب کے ان برتنوں کے استعمال سے بھی روکدیا جنھیں شراب بنائی جاتی تھی۔ کیونکہ ہو سکتا تھا برتنوں کو دیکھکر شراب کی مستیاں یاد آجاتیں اور توبہ پاش پاش ہو جاتی۔ امرہم باربع۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجمال میں چار چیزیں بتلائیں لیکن تفصیل میں ذکر پانچ چیزوں کا کیا، اس میں انطباق کی کیا صورت ہے؟ اس کی مختلف توجیہیں بیان کی گئی ہیں، پہلی توجیہ یہ ہے کہ ایمان باللہ وحدہ تفسیرہ شہادۃ ان لا الہ الا اللہ الخ اس سے خارج ہے، ماموربہ نہیں ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ان کو پہلے سے اس کا علم تھا، یہاں اس کا ذکر محض توطئۃً وتمہیداً فرمایا گیا ہے۔ اگر ایسے نہ کہا جائے تو تحصیل حاصل لازم آئے گی۔ وجہ یہ ہے کہ آپؐ بذریعہ خط تعلیم فرما بھی چکے تھے اور یہ لوگ جان بھی چکے تھے، اسی باعث منذر ابن عائذ الاشج مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آئے ہیں، ہم کہیں گے کہ اس وقت اصل مقصود بالتعلیم بعد کی چار چیزیں ہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ مامورات اربع میں سے اسجگہ صرف امر واحد کا ذکر ہے، اور وہ ہے ایمان باللہ وحدہ، باقی اور چیزیں اس کی تفسیر میں، اس توجیہ پر مصنفؒ کا ترجمہ بھی منطبق ہوتا ہے اس لئے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک ایمان ان سب امور کا مجموعہ ہے۔ باقی رہیں تین

چیزیں سوان کو بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا ہو گا مگر راوی نے اختصاراً ان کو ترک کر دیا۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ مامورات اربع ہمیشہ معمول بہا ہیں اور پانچویں شے یعنی اعطاء الخمس من المغنم تذنیب ہے، اس خاص وقت کے لئے ہے جبکہ مجاہدین جہاد کر کے مال غنیمت لائیں، تو معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعطاء خمس من المغنم کو تبعاً اور تکمیلاً ذکر فرمایا ہے، ورنہ درحقیقت بات یہ ہے کہ غنیمت جہاد سے متعلق ہے اور جہاد خود فرائض علیہ اور نفسِ عبادت میں سے نہیں ہے بلکہ اس کی مشروعیت محض ضرورۃ اور لغیرہ ہے ای لدفعِ المفسدہ۔ اسی لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اصول میں داخل نہیں کیا مگر چونکہ کفارِ مضر سے ان کا ہمیشہ اور عموماً مقابلہ رہا کرتا تھا اس لئے آپ عبادت لغیرہ کو تذنیباً بیان فرما رہے۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ ایک ہی شے ہیں، قرآن حکیم میں دونوں کا ذکر ایک ہی ساتھ آتا ہے، بعض حضرات نے زکات وخمس کو ایک قرار دیا ہے کیونکہ دونوں میں دینا ہوتا ہے۔ واقام الصلوٰۃ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اَمرِ نفس الصلوٰۃ نہیں فرمایا بلکہ اقام الصلوٰۃ کا حکم فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ اقامت مطلوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ عموماً آیاتِ قرآنیہ اور روایات کے اندر اقامت ہی کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ اقامت کے معنی ادا کے بھی آتے ہیں، تو مراد یہ ہے کہ نماز کو ادا کرو بایں طور کہ تم اس پر دائم رہو، اس کی پابندی کرو۔ اِقامت کے دوسرے معنی قائم کرنے کے آتے ہیں، کسی مکان کو اس وقت تک قائم نہیں کہا جا سکتا تاوقتیکہ وہ مکمل نہ ہو جائے، تو مراد یہ ہے کہ نماز مع جمیع شرائط وآدابہ وحقوقہ اَدا کی جائے۔ وایتاء الزکوٰۃ۔ اس جگہ ایتاء کا لفظ فرمایا گیا ہے، اخراج کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا اس لئے معلوم ہوا کہ ادائے زکات کیلئے تملیک ضروری ہے، محض الگ کر کے رکھدینا کافی نہیں ہو گا، مثلاً کوئی شخص مال نکالکر زکات کی نیت سے علیحدہ رکھدے اور پھر وہ مال چوری ہو جائے تو احناف کے نزدیک زکات نہیں ہو گی، کیونکہ ان کے یہاں تملیک ضروری ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس صورت میں بھی زکات ادا ہو جائے گی۔ (وجہ عدمِ ذکرِ حج) عدمِ

ذکر حج کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت حج کی فرضیت نہیں ہوئی تھی۔ حج کی فرضیت باختلاف شرح یا ۹ھ میں ہوئی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہ لوگ بہت دور رہتے تھے ان کے لئے استطاعتِ سبیل نہیں تھی اس لئے کہ کفارِ مضر کے مہیب خطرے سدِ راہ تھے۔ بایں وجہ ان پر حج کا وجوب نہیں ہوا۔ حنتم وہ ٹھلیا جس پر لاکھ کا روغن کر دیا گیا ہو۔ نقیر اس برتن کو کہتے ہیں جو درخت کی جڑ میں کھوکھلاپن پیدا کرکے بنایا گیا ہو۔ مزفت۔ جس برتن پر زفت یعنی چیڑ کا تیل مَل دیا جائے یا رال لگا دی جائے، اس سے بھی برتن کے مسامات بند ہو جاتے ہیں اور شراب میں شگر جلد پیدا ہو جاتا ہے۔ دبا۔ کدو کو درخت ہی میں خشک کرکے اندر سے گودا نکالکر تومڑی بنائی جاتی ہے اسی کو دبا کہتے ہیں

باب ما جاء ان الاعمال بالنیۃ والحسبۃ الخ حدثنا.... عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اعمال کا اعتبار نیت پر موقوف ہے اور ہر آدمی کیلئے وہی ہوگا جس کی اس نے نیت کی پس جس شخص نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی پس اس کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کی طرف ہے۔ اور جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کیلئے ہجرت کی پس اس کی ہجرت اسی طرف ہوگی جس کی نیت سے اس نے کی ہے ؛

حدثنا.... ابی مسعودؓ نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی ثواب کی نیت سے اپنے عیال پر خرچ کرے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے ؛

حدثنا.... ابی وقاص نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی خوشنودی کیلئے تو جو کچھ خرچ کرے گا تجھے اس کا یقیناً اجر ملیگا حتیٰ کہ تو اپنے ہاتھ سے اپنی بیوی کو جو چیز کھلائے گا تجھے اس کا بھی ثواب عطا کیا جائے گا ؛

پہلی روایت کیف کان بدأ الوحی، میں مذکور ہے وہاں اس کے متعلق پوری تفصیل بیان کی جا چکی لیکن یہاں اور وہاں کے مقصد میں فرق ہے، وہاں مقصود تھا عصمتِ وحی کا اثبات، اور

یہاں مقصود ہے اثبات نیت لکل عمل۔ حسبۃ، اخلاص کو کہتے ہیں، آگے بتارہے ہیں کہ ہر عمل چونکہ نیت ہی پر مبنی ہوتا ہے اس لئے ایمان بھی بغیر نیت کے معتبر نہیں ہوسکتا اسی وجہ سے مصنفؒ کہتے ہیں کہ فدخل فیہ الایمان الخ کیونکہ امام بخاریؒ کے نزدیک ایمان بھی عمل من الاعمال ہے۔ البتہ متکلمین اس کو عمل نہیں کہتے بلکہ اعتقادِ جازم کو ایمان کہتے ہیں اور اعتقادِ جازم خود قلب سے متعلق ہے اس واسطے اس کے لئے نیت کی ضرورت نہیں، بخلاف محدثین کے ان کے یہاں چونکہ اعمال و اقوال اور اعتقادات داخل فی الایمان ہیں اس وجہ سے اس کی خاطر ضرورت ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ وضوء بھی عمل من الاعمال ہے لہٰذا اس کیلئے بھی نیت ضروری ہونی چاہئے، پھر احناف اس میں کیوں نیت ضروری نہیں سمجھتے؟

وضوء کا مسئلہ دراصل مختلف فیہ ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ وسائل کے لئے نیت شرط نہیں اگر کوئی آدمی تالاب یا کنویں میں اتفاقاً گر گیا اور اس کے اعضاء وضوء پر پانی تیر گیا تو اس کا وضوء ہو جائے گا۔ مگر شوافع کے نزدیک اس شخص کا وضوء نہیں ہوگا اس لئے کہ ان کے یہاں نیت ضروری ہے، حنفیہ کے یہاں وضوء کے اندر دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت وسیلہ ہونے کی اور دوسری حیثیت مقصود ہونے کی، بلاشبہ اس کی شانِ مقصودیت محتاجِ نیت ہے لیکن شانِ وسیلہ محتاجِ نیت نہیں، مثلاً وضوء سے دو مقصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ وہ وسیلۃ للصلوٰۃ ہو اور دوسرے یہ کہ وضاءۃ ولمعان کے لئے ہو، غرِّ محجلین کی صف میں داخل ہونے کیلئے ہو، تو وضوء کے مفتاح للصلوٰۃ ہونے کے لئے نیت کی ضرورت نہیں مگر وضاءۃ ولمعان کے حصول کیلئے نیت ضروری ہے۔ شوافع احناف پر اعتراض کرتے ہیں کہ جیسے وضوء نماز کیلئے وسیلہ ہے ایسے ہی تیمم بھی وسیلہ ہے۔ وضوء کی جو حیثیت ہے نماز کیلئے وہی حیثیت بعینہٖ تیمم کی بھی ہے۔ جیسے وضوء مقصود بالذات نہیں ہے بالعرض ہے ایسے ہی تیمم کی بات ہے؟

اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں (۱) تیمم کے معنی خود قصد کرنے کے آتے ہیں لہٰذا لازم تھا کہ معنی لغوی و اصطلاحی میں مناسبت پیدا کرنے کیلئے نیت ضروری قرار دی جائے (۲) طہارت

کے اندر وضو اصل ہے اور تیمم اس کی فرع بنا بریں تیمم میں نیت ضروری ہے۔ (۳) وضو پانی سے کی جاتی ہے اور پانی میں طہارتِ اصلیہ موجود ہے۔ وانزلنا من السماء ماءً طہوراً بخلاف مٹی کے کیونکہ اس میں طہارتِ اصلیہ موجود نہیں بلکہ ضرورت (پانی پر قدرت نہ ہونے) کی وجہ سے آتی ہے اسی لئے تیمم میں نیت ضروری ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ نیت سے کیا مقصود ہے؟ ابن قیم، مجددِ الف ثانی اور بعض غیر مقلدین زبانی نیت کرنے کو بدعت کہتے ہیں، جمہور کے نزدیک زبانی نیت مستحب ہے، وقد ثبت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نوی فی الحج بالتکلم اللسانی لانہ قال لبیک بحجۃ وفی روایۃ لبیک بحجۃ وعمرۃ، فقاسوا علیہ۔ وقالوا بانہ یستحب النیۃ اللسانی واما نیتہ بالقلب فتجب وتتفق علیہ صحۃ الصلوٰۃ۔

والزکوٰۃ۔ اموال ظاہریہ مثلاً گائے اونٹ وغیرہ کی زکات حکومت کے عمال وصول کرتے ہیں اس میں اگر زکات کی نیت نہ بھی کی ہو تو بھی زکات ادا ہو جائے گی لیکن اگر سونا چاندی اور اسی طرح کے دوسرے اموال جو ظاہری نہیں ان میں یعنی مالِ صامت میں نیت ضروری ہے۔

والحج۔ اگر ایک شخص نے دوسرے کی جانب سے حج کیا تو اس کی نیت ضروری ہے کہ میں فلاں کی جانب سے حج کر رہا ہوں، اسی طرح وہ اگر اپنا حج کرے، تو بھی نیت ضروری یا واجب ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولکن جہاد ونیتہ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاہجرۃ بعد الفتح ولکن جہاد ونیتہ یعنی نیۃ الہجرت اور نیۃ الجہاد۔ اس باب کے اندر تین حدیثیں ذکر کی گئی ہیں جنمیں پہلی حدیث الاعمال بالنیۃ الخ ہے اسے ایمان سے کوئی مناسبت نہیں اس لئے مصنفؒ نے بتایا کہ ایمان میں بھی نیت ضروری ہے اور نیت کے لئے ضروری ہے کہ اعمال بھی ایمان کے اندر داخل ہوں، ورنہ نیت کے شرط ہونے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔ اس سے مرجیہ وکرامیہ کی تردید بھی ہو گئی، اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف اشارہ بھی کہ تم لوگ جب اس کتاب کو پڑھو تو اچھی اور خالص نیت کے ساتھ پڑھو۔ دوسری روایت ہے جس کے اندر راوی ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ ہیں، زوجہ کا نفقہ فرض ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو ادا کر رہا ہے تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہا ہے، اس میں

صدقہ ہونے کے کیا معنی، جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ اطاعتِ خداوندی کیلئے اور حسبۃً للہ نفقہ ادا کر رہا ہے تو حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے صدقہ کا ثواب عطا فرمائے گا۔ تیسری روایت میں اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، شوہر اپنی بیوی کے منہ میں اپنے ہاتھ سے لقمہ دیتا ہے جو ظاہر ہے کہ برائے استلذاذ ہے لیکن اگر اس کے اندر بھی نیت خیر ہے تو یہ بھی صدقہ اور موجب ثواب بن جاتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کا واقعہ ہے (جس کی یہاں تفصیل نہیں) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ میں تشریف لیگئے تو حضرت سعدؓ بھی آپؐ کی ہمراہ تھے یہ بیمار ہو گئے اور تکلیف ناامیدی کی حد تک بڑھ گئی، انہوں نے آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اپنا مال صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے انکار فرمادیا۔

دوسری بات حضرت سعدؓ نے یہ عرض کی کہ یا رسول اللہ میرا ---- یہاں انتقال ہو جائے گا جس کی وجہ سے میری ہجرت پر حرف آئے گا۔ آپؐ نے انھیں تسلی دی خوشخبری سنائی کہ ابھی تمہاری ذات سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور کفار کو ضرر ونقصان! یعنی ابھی تمہاری وفات نہیں ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ کسریٰ کی فوجوں کا سعدؓ نے نہ صرف یہ کہ زبردست مقابلہ کیا بلکہ انھیں شکستِ فاش دی اور سعد رضی اللہ کی جدوجہد کی بدولت سارے فارس میں اسلام پھیل گیا۔ نیز انہوں نے جنگِ قادسیہ میں فوجوں کو اتنے اعلیٰ پیمانہ پر ترتیب دیا کہ یورپ آج تک اس کے تصور سے خوف زدہ ہے

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحۃ للہ الخ حدثنا .... جریر ابن عبد اللہ البجلی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز قائم کرنے زکات دینے اور ہر مسلمان کی خیرخواہی کرنے پر بیعت کی ؛

حدثنا .... زیاد بن علاقہ سے روایت ہے کہتے ہیں مغیرہ بن شعبہ کی وفات کے دن میں نے جریر بن عبد اللہ سے سنا کھڑے ہوئے اور اللہ جل جلالہٗ کی حمد وثنا کی اور فرمایا لازم ہے تمھیں اللہ واحد لاشریک کا خوف۔ اور لازم ہے تمہارے لئے وقار وسکون تاوقتیکہ

تمہارے پاس دوسرا امیر آئے اور وہ تمہارے پاس ابھی آتا ہے۔ پھر فرمایا تم اپنے امیر کے لئے معافی طلب کرو کیونکہ وہ معاف کرنے کو اچھا سمجھتا تھا اس کے بعد اس نے کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ سے اسلام پر بیعت کرتا ہوں، پس آپ نے اسلام پر اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر شرط پیش کی، میں نے اس امر پر بیعت کر لی اور کہا قسم ہے اس مسجد کے رب کی میں تمہارا خیر خواہ ہوں، پھر اس نے بخشش طلب کی اور منبر سے اتر آیا۔

چونکہ یہاں نصیحت کا حمل اولیٰ دین پر کیا گیا ہے اور دین و ایمان مصنفؒ کے نزدیک مترادف ہیں اس لئے نصیحت بھی ایمان ہوئی لہٰذا معلوم ہوا کہ نصیحت و ایمان میں مناسبت ہے، نصیحت نصح سے ماخوذ ہے، نصح کہتے ہیں شہد سے موم نکالنے کو۔ یقال نصح الشئی اذا خلصہ، مگر بعد میں یہ لفظ خلوص کے لئے بولا جانے لگا۔ توبۃ نصوحا۔ ای خالصۃ۔ تو نصیحت للہ کے معنی ہوئے منافقت سے خالص ہونا، غل و غش سے خالص ہونا۔ نصح کے معنی بعض لوگوں نے خیاطت کی کئے ہیں اور پراگندہ و منتشر حالات سنوار دینے کے۔ بہر حال اسی مناسبت سے نصیحت کہنے لگے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نصیحت سے مراد اس جگہ خلوص ہے، اب نصیحت کا حمل دین پر ہوا حالانکہ وہ جزء من الدین ہے، محض مبالغہ کی خاطر ہے ای معظم الدین النصیحۃ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ میں نے کتاب الایمان میں جو مباحث بیان کئے ہیں وہ صرف جذبۂ خلوص پر مبنی ہیں، اس میں ہوائے نفس کو کوئی دخل نہیں۔

النصیحۃ للہ۔ اللہ تعالیٰ سے اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو بہر حال شریک نہ گردانے نہ ظاہراً نہ باطناً اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے طاعت و عبادت کو خالص کر دے، ہر قدم آگے بڑھانے سے پہلے یہ جان لے کہ آیا میرا قدم اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو پورے ذوق و شوق اور دلجمعی کے ساتھ مقصد کی جانب بڑھے ورنہ پیچھے ہٹ جائے۔ ولرسولہ۔ آپؐ کی سنتوں کا اتباع بالکل خلوص سے کرے۔ ولائمۃ المسلمین۔ ائمہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین کی بتائی ہوئی باتوں پر

چلے، اور انھیں اپنے لئے راہِ عمل بنائے۔ یہ مقدس حضرات خدا اور رسول ہی کی باتیں پیش کرتے ہیں والناس۔ لوگوں کو نیک باتیں بتائی جائیں، ان کو صراطِ مستقیم پر چلانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ عن جریر ابن عبداللہ۔ یہ آخر میں ایمان لائے ہیں۔ آپؐ کی وفات سے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ قبل۔ ان کے قبیلہ میں ایک کعبہ تھا جسے اہلِ قبیلہ کعبہ شرقیہ کہا کرتے تھے اور اس کا نام ذوالخلصہ تھا۔ آپؐ نے انھیں حکم فرمایا کہ تم جاؤ اور اس نام نہاد کعبہ کو منہدم کردو۔ چنانچہ یہ قبیلۂ بجیلہ کے خاندان احمس کے لوگوں کو اپنی ہمراہ لے کر گئے اور ذوالخلصہ کو جلا کر خاک کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جب جہاد کا حکم فرمایا تو انھوں نے عرض کیا کہ لاأثبت علی الخیل۔ یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا جس کی برکت سے یہ پھر کبھی گھوڑے سے نہیں گرے۔ والنصح لکل مسلم۔ معلوم ہوا کہ نصح ہر مسلمان سے ضروری ہے اس میں بڑے چھوٹے یا خاص وعام کی کوئی قید نہیں۔

حدثنا ابو نعمان۔ یہ واقعہ حضرت معاویہؓ کے زمانہ کا ہے اس وقت کوفے کے گورنر مغیرہؓ تھے مگر جب یہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے اپنا جانشین حضرت جریر ابن عبداللہ البجلی کو بنا دیا چنانچہ حضرت مغیرہ کے انتقال کے بعد جریر ابن عبداللہ منبر پر آئے اور یہ خطبہ دیا فانما یاتیکم الآن الآن میں الف لام عہد خارجی ہے اور آن حادث کے لئے بولتے ہیں، فرعون کے قول پر کہ میں ایمان لایا اس خدا پر جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے، حق تعالیٰ نے فرمایا الآن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین۔ تو یہاں آن حادث ہی مراد ہے مگر مذکورہ حدیث میں آنِ حادث مراد لینا درست نہیں، اس لئے کہ ابھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو وفاتِ مغیرہ کی اطلاع بھی نہیں ہوئی کہ وہ کوئی دوسرا امیر بھیجدیں؟

جواب یہ ہے کہ آن اس جگہ حقیقت پر نہیں ہے بلکہ آن سے مراد آن قابل تمنی قریب ہے یہی توجیہ مشہور ہے لیکن بعض اہل علم حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہاں آن حادث ہی مراد ہے اور امیر سے خود اپنے نفس کو مراد لیتے ہیں اس لئے کہ یہ بھی نائب امیر تھے۔

ابایعک علی الاسلام۔ ابایعک بیع سے ماخوذ ہے جب معاملہ طے ہو جاتا تھا تو بائع ومشتری

ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے۔ مگر اب ہر عہد کو بیعت کہنے لگے۔ لہٰذا جب بھی کوئی عہد لیا جائے گا ہاتھ پر ہاتھ رکھکر معاہدہ کیا جاتا رہے گا۔

یہاں بیعت علی النصح ہے اور حدیبیہ میں بیعت علی الموت لی گئی تھی۔

کتاب الایمان ختم شد

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)